جماعت اسلامی عوامی عدالت میں

کوثر نیازی

جماعت اسلامی
عوامی عدالت
میں

کوثر نیازی

قومی کتب خانہ

ریلوے روڈ لاہور

مندرجات

باب اوّل۔

جماعت اسلامی سے میری علیحدگی اور
اس کے اسباب۔ ــــــ ــــــ ــــــ ــــــ ۷

باب دوم

جماعت اِسلامی اور حیاتِ ملّی ــــــ ــــــ ۴۳

باب سوم

قیامِ پاکستان کے بعد جماعت اِسلامی کا کردار ــــ ۹۳

باب چہارم

چند مغالطوں کی اِصلاح ــــــ ــــــ ــــــ ۱۱۷

باب پنجم

خلافت و ملوکیت ــــــ ــــــ ــــــ ۱۳۱

باب ششم

اسلام کی اجارہ داری ــــــ ــــــ ــــــ ۱۵۱

حرفِ آغاز

جماعت اسلامی کے متعلق میری تحریریں پہلی دفعہ یکجا شائع ہو رہی ہیں، اس سے پہلے اس موضوع پر میرے دو کتابچے شائع ہو چکے ہیں، "میں نے جماعت اِسلامی کیوں چھوڑی" اور "مودودیت عوامی عدالت میں"۔ عوامی تحریک کے دوران یہ دونو کتابچے خوب خوب پھیلے مگر ضرورت تھی کہ ان دونوں کتابچوں اور میری اُن تحریروں کو جو جماعت اور اس کے امیر کے متعلق مَیں نے ہفت روزہ "شہاب" کی ادارت کے زمانے میں لکھی تھیں، ایک ہی کتاب میں جمع کر دیا جائے تاکہ اہلِ وطن "مذہبی سیاست" اور ایک سیاسی مذہب میں اِمتیاز کرنے کے قابل ہو سکیں۔

ان تحریروں میں سے کچھ طنزیہ رنگ میں ہیں تو کچھ علمی رنگ میں، قارئین انہیں زمانۂ تحریر کے مخصوص سیاسی اور مذہبی ماحول اور واقعاتی تاثر سے علیحدہ کر کے نہیں دیکھ سکتے، میں چاہتا تو نظرِ ثانی کر کے اندازِ نگارش کو بدل دیتا لیکن اس طرح شاید وہ تاثر مجروح ہو جاتا جو ایک بات کو واقعات کے پس منظر میں سمجھتے ہوئے پیدا ہوتا ہے۔

باب اول

جماعتِ اسلامی سے میری علیحدگی اور اس کے اسباب

- میرے علاوہ کتنی اور لوگوں نے بھی اس سے علیحدگی اختیار کی۔ ———— ۹
- علیحدگی کے وقت میرا جو بیان اخبارات میں چھپا۔ ———— ۱۳
- مولانا مودودی کے نام تفصیلی مکتوب ———— ۱۸
- مولانا مودودی کا جواب ———— ۳۸
- میرا استعفا ———— ۳۹

فصل ـــــ ۱

میرے علاوہ کئی اور لوگوں نے بھی اس سے علیحدگی اختیار کی

سیرت کی سبھی کتابوں میں یہ واقعہ ملتا ہے کہ ابوسفیان حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف ہرقل قیصر روم سے امداد لینے کے لیے پہنچا تو اُس نے بھرے دربار میں آنحضورؐ کے سیرت و کردار کے بارے میں اس سے جو چند سوالات کیے، ان میں سے ایک سوال یہ بھی تھا کہ جو لوگ آپؐ کی دعوت کو قبول کرتے ہیں، کیا ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان میں سے کوئی ناراض اور غیر مطمئن ہو کر اُن کو اور اُن کے طریقے کو چھوڑ دیتا ہو؟ ابوسفیان نے جواب دیا "ایسا تو نہیں ہوتا۔" اس پر ہرقل نے ایک بڑی خوب صورت بات کہی۔ اُس نے کہا ـــ "بے شک انبیاء کی یہی شان ہوتی ہے کہ جو کوئی ان کی دعوت کو قبول کرلے اور اُن سے جُڑ جائے۔ پھر وہ اُن سے جُدا نہیں ہوتا۔"

ہرقل کی اس بات پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک بزرگ عالمِ دین نے بہت ٹھیک لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح نسبت رکھنے والے آپؐ کے وارثوں کا حال بھی یہی ہوتا ہے لیکن اگر سیرتِ مصطفوی اور صفاتِ محمدی کے رنگ و بُو سے کسی کی زندگی خالی ہو تو اس کی

دیانت پر بھی کیوں بھروسہ کریں ؟

مَیں جماعتِ اسلامی سے فروری ۱۹۶۵ء میں علیحدہ ہُوا۔ مَیں اُس وقت جماعت اسلامی حلقہ لاہور کا امیر تھا۔ اختلافات کافی عرصہ سے چلے آ رہے تھے۔ جب تک میں دینی علم حاصل نہ کر سکا، عربی زبان نہیں جانتا تھا، مودُودی صاحب کے لٹریچر کا سحر مجھ پر قائم رہا۔ مگر جب میں براہِ راست کتاب وسُنّت کے سرچشمۂ فیض سے سیراب ہونے لگا اور میں نے عُلماء ومفسّرین اور ائمہ وفقہاء کی علمی وفکری کاوشوں کو سامنے رکھ کر مودُودی صاحب کے لٹریچر کا تقابلی مطالعہ کیا تو مجھ پر مودُودی صاحب کے علمی وعملی تضادات آشکارا ہونے لگے اور مجھے اندازہ ہُوا کہ یہ تو ایک جُداگانہ مذہب ہے۔ یہ بات جماعت کے بہت سے دُوسرے لوگ بھی محسُوس کرتے تھے (اور مجھے ذاتی طور پر معلوم ہے کہ آج بھی محسوس کرتے ہیں) مگر اس جماعت میں شامل ہونے کے بعد اسے چھوڑنا آسان کام نہیں۔ رشتے ناتے، کاروبار، تنخواہیں اور اسی بُنیاد پر دوستیاں، دشمنیاں کتنی ہی باتیں ہیں جو حسن بن صباح کی اس جنّت سے نکلتے وقت زنجیر پا بن جاتی ہیں۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا خاص فضل وکرم تھا کہ اس نے مجھے یہ بیڑیاں کاٹنے کی توفیق عطا فرمائی۔

جماعت کو چھوڑے ہوئے مجھے پانچ سال ہو گئے۔ "شہاب" کے صفحات گواہ ہیں، مَیں نے مودُودی صاحب اور اُن کی جماعت کے بارے میں اس وقت تک زبان نہیں کھولی جب تک "خلافت وملوکیت" جیسی رسوائے زمانہ کتاب سامنے نہیں آگئی۔ جب میں نے دیکھا کہ مودُودی صاحب کے قلم نما نیزے نے صحابہ کرام اور اہلِ بیت کے سینے بھی چھلنی کر دیئے ہیں، تو میں نے طے کر لیا کہ اس نئی "خارجیت" کے بالمقابل سینہ سپر ہو جاؤں۔

میرے بارے میں مودُودی صاحب کی شہ پر اُن کے تنخواہ دار کارکنوں نے ملک کے طُول وعرض میں کیا کیا غلیظ پروپیگنڈا نہیں کیا۔ مودُودی صاحب کا جو خط اس کتابچے میں شامل ہے اس میں انھوں نے لکھا تھا، تم جو کچھ لکھو بولو گے، مَیں اس پر صبر کروں گا لیکن

فصــــل ــــ ۲

علیحدگی کے وقت میرا جو بیان اخبارات میں چھپا

مولانا امین احسن اصلاحی کا ادارتی نوٹ

اس شمارے میں ہم مولانا کوثر نیازی کا ایک بیان، امیر جماعتِ اسلامی کے نام اُن کا ایک مفصل خط، امیر جماعت کی طرف سے اس کا جواب اور کوثر صاحب کا جماعت سے استعفا شائع کر رہے ہیں۔

کوثر صاحب اُن لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے پُورے سترہ سال ہر طرح کے نرم گرم حالات میں جماعت کے ساتھ گزارے ہیں۔ ان کا ہفتہ وار اخبار "شہاب" جماعت کا نہایت سرگرم حامی رہا ہے اور ادھر ایک عرصے سے خود اُن کا شمار بھی جماعت کے صفِ اوّل کے لیڈروں میں ہوتا رہا ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ قارئین میثاق ان تحریروں میں جماعتِ اسلامی کے باطن کا ایک عکس دیکھ سکیں گے اور اس سے ہمارے اُن خیالات کی تصدیق ہوگی جو ہم نے اس جماعت سے متعلّق میثاق کے پچھلے چند شماروں میں ظاہر کیے ہیں۔

اس بیان پر تبصرہ اور بعض دُوسرے اہم مسائل کا تذکرہ تو انشاء اللہ آئندہ ہم کریں گے۔ اس وقت صرف اس گزارش پر اکتفا کرتے ہیں کہ کوثر صاحب کے اس بیان کے جس

اظہار جماعتِ اسلامی پاکستان کے امیر مولانا مودودی صاحب سے زبانی اور تحریری دونوں صورتوں میں کرتا رہا ہوں اور میں نے پوری کوشش کی ہے کہ جماعت میں رہتے ہوئے اصلاحِ احوال کی کوشش کروں مگر افسوس کہ میری یہ ساری کوششیں بے سود ثابت ہوئیں۔ اور بالآخر مجھے یہ تکلیف دہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہونا پڑا ہے کہ میں جماعت سے اپنا تعلق منقطع کر لوں۔

حال ہی میں میں نے مولانا مودودی کے نام ایک مفصل مکتوب لکھا تھا جس میں بڑی دردمندی کے ساتھ اُن اصولی اور عملی خرابیوں کی نشان دہی کی گئی تھی جو جماعت کے موجودہ طریقِ کار اور اُس کی قیادت کے طرزِ فکر و عمل سے رونما ہو رہی ہیں اور اُنھیں توجہ دلائی تھی کہ ان خرابیوں کے انسداد کے لیے مؤثر تدابیر اختیار کرنے کی ضرورت ہے ورنہ ہماری تنظیم ملک و ملّت اور دین و شریعت کی کوئی خدمت انجام دینے کے بجائے اُلٹا ان کی ضرر رسانی کا ذریعہ بن جائے گی۔ اِس سلسلہ میں میں نے پاکستان بھر کے ارکانِ جماعت کا اجتماع بُلانے کی تجویز بھی پیش کی تھی مگر مولانا مودودی نے اس مکتوب کے جواب میں جو طرزِ عمل اختیار کیا، وہ حد درجہ افسوس ناک اور اُن کے آمرانہ مزاج کا کھُلا ثبوت ہے۔

جماعت کی دینی اور جمہوری حالت اس وقت یہ ہے کہ صدارتی انتخاب کے موقع پر پچھلے دنوں جماعت کی مجلسِ مشاورت نے جو قرارداد پاس کی تھی وہ جیل میں مولانا مودودی نے لکھی تھی اور اسے لفظ بلفظ مجلسِ مشاورت کا فیصلہ قرار دے کر جمہوریت کا مُنھ چڑایا گیا تھا۔ جماعت بُنیادی جمہوریتوں پر تنقید اور بالغ رائے دہی کا مطالبہ کرتی ہے مگر خود اس نے اپنے نظام میں اس طرح کی درجہ بندی قائم کر رکھی ہے اور ہزاروں کارکنوں میں سے صرف پندرہ سو ارکان کو ووٹ کا حق دیتی ہے، جماعت پر تنخواہ دار لیڈر شپ مُسلّط ہے۔ اس کا ہر دسواں رکن تنخواہ دار ہے۔ حد یہ ہے کہ اس کی ہیئتِ حاکمہ مجلسِ عاملہ تک کے ارکان جن میں سب امرائے حلقہ شامل ہیں، سب کے سب

دِل چسپی رکھنے والا باشعور طبقہ خود یہ فیصلہ کر سکے کہ ان حالات میں میرے لیے اس کے سوا اور کیا چارۂ کار باقی رہ گیا تھا کہ مَیں جماعت سے مستعفی ہو جاؤں۔"

کوثر نیازی

۲۱ر فروری ۱۹۶۵ء

میں "مسٹر سہروردی سے چند سوالات" کے زیرِ عنوان ایک اداریتی شذرہ سپردِ قلم کیا تھا۔ مقصود یہی تھا کہ جو لوگ غیر اسلامی نظریات کے علَم بردار اور مُلک میں جمہوریت کے قاتل ہیں، جماعت ان کی طرف دستِ تعاون بڑھانے سے باز رہے۔ اس پر آپ نے ایک ملاقات میں ایسی تحریریں لکھنے سے منع کر دیا تھا کیونکہ آپ کے نزدیک اس سے جماعت کی پوزیشن خراب ہوتی تھی۔ مَیں نے آپ کے اس حکم کی تعمیل کی مگر اس کے ساتھ میں برابر "شہاب" کے ذریعے ایک اسلامی محاذ کی تشکیل پر زور دیتا رہا۔

۱۹۶۴ء میں جماعتِ کو خلافِ قانون قرار دے دیا گیا اور اُس زمانے میں مرکزی دفتر کے باقی ماندہ اصحاب نے محاذ کے قیام کے لیے دُوسری پارٹیوں کے ساتھ پھر سے مذاکرات شروع کر دیئے۔ میرا خیال یہ تھا کہ جماعت موجود نہیں اور یہ اصحاب اپنی ذاتی حیثیت میں محاذ میں شریک ہو رہے ہیں۔ اس لیے میں نے ۱۶ فروری ۱۹۶۴ء کے "شہاب" میں ایک مرتبہ پھر تفصیل سے اپنے نقطۂ نظر کا اظہار کیا اور دلائل سے واضح کیا کہ اس طرح کے متضاد اور متصادم عناصر کا اتحاد مُلک و ملّت، دینی اقدار اور خود جماعت کے لیے سخت تباہ کُن ثابت ہوگا۔ اِس مضمون کے چھپتے ہی ان رفقاء نے میرے خلاف پروپیگنڈہ مہم تیز تر کر دی۔ کارکنوں کو یہ یقین دلایا گیا کہ انھوں نے یہ سب کچھ جیل سے آئی ہُوئی ہدایات کے مُطابق کیا ہے اور دُوسری طرف یہ دھمکی دے کر میرا مُنھ بند کرنے کی کوشش کی گئی کہ اگر مَیں اس طرح کے خیالات ظاہر کرنے سے باز نہ آیا تو خلافِ قانون قرار دیئے جانے کے باوجود جماعت کا جو ڈھانچہ اپنے طور پر اُنھوں نے قائم کر رکھا ہے وہ پُورے مُلک کے متعلقین کو جماعت سے میرے نکل جانے کی اطلاع کر دے گا۔

مَیں پروپیگنڈے کی اس مہم سے متاثر تو نہیں ہُوا (اس لیے کہ میرے خلاف اس طرح کی کئی مہمیں عرصہ سے بعض ممتاز اصحاب کے زیرِ سایہ جاری تھیں اور میں زبانی اور تحریری طور پر کئی دفعہ آپ کو ان کی اطلاع بھی دے چُکا ہُوں) لیکن اس خیال سے کہ آپ

پر پہنچا ہوں کہ اس سے جماعت ایک ایسے راستہ پر ڈال دی گئی ہے جو دینی اعتبار سے سخت دو غلے پن بلکہ (مجھے اس سخت لفظ کے استعمال کے لیے معاف فرمائیے) نفاق کا راستہ ہے اور سیاسی حیثیت سے فہم و فراست اور حکمت و دانش کے پہلو سے ہمارے دیوالیہ ہو جانے کا اعلانِ عام ہے۔ اس قرارداد کا تضاد خلقِ خدا کے ساتھ ساتھ مضطرب ارکان اور کارکنوں کو مغالطے میں ڈالنے کی ایک دردناک مثال پیش کرتا ہے۔

اِس قرارداد کے ایک حصّہ میں تو کُھلم کُھلا اعتراف کیا گیا ہے کہ:۔

"۔۔۔۔ یہ اخلاقی حالت اگر ہماری قوم کی نہ ہوتی تو انتخابات کے یہ نتائج ہرگز ہرگز برآمد نہ ہو سکتے تھے۔ یہ صورتِ حال اس امر کی ضرورت کو بالکل واضح کر دیتی ہے کہ خود جمہوریت کی بحالی کے لیے بھی قوم کی اصلاح ناگزیر ہے۔ جب تک ہم طبقات کے اخلاق کو پختہ بنیادوں پر استوار کرنے کی فکر اور کوشش نہ کریں گے اس وقت تک دھن، دھونس اور دھاندلیوں کے ذریعے سے آمروں کے مسلّط ہونے کا دروازہ بند نہ ہو سکے گا۔"

اور اس کے دُوسرے حصّوں میں یہ کہہ کر مغالطہ دہی کی حد کر دی گئی ہے کہ:۔۔۔۔

"۔۔۔۔ گزشتہ تین ماہ میں قوم جس آزمائش سے گزری ہے۔ اس سے یہ احساس بالکل واضح ہو گیا ہے کہ وہ اب بیدار ہے اور اپنے حقُوق کے لیے ہر ممکن جدوجہد کا داعیہ رکھتی ہے۔"

اس کے ساتھ دُوسرے فیصلوں میں اس امر کا بھی واشگاف الفاظ میں اعلان کیا گیا ہے کہ:۔

"۔۔۔ جماعتِ اسلامی متحدہ محاذ کا بدستور ساتھ دیتی رہے گی۔"

ان قراردادوں کا جو مطلب مَیں سمجھا ہوں اور جو میرے خیال میں ہر پڑھا لکھا آدمی سمجھے گا، یہ ہے کہ جماعت اپنے ارکان کے اندر پیدا شدہ بے چینی کو الفاظ کے

اُن سے بھی دو قدم آگے بڑھ جاتے ہیں کہ نہیں ساری حرمتیں قرآن کی بھی ابدی نہیں ۔ حرمتیں قرآن کی ہوں یا حدیث کی سب کی سب ابدی اور غیر ابدی کے خانوں میں تقسیم ہیں۔

محترم مولانا، یقین فرمایئے کہ اس نظریہ کی تاویل میں اب تک آپ نے یا دُوسرے حضرات نے جو کچھ لکھا یا کہا ہے وہ میری نظر میں ہے (اور یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ جماعتی پالیسی کی جبرّیت کے تحت مَیں خود آپ کے اس نظریہ کا دفاع کرنے والوں میں رہا ہوں) مگر اس کے باوجود اس نظریہ کی صحت مجھ پر واضح نہیں ہوسکی اور آج جب کہ یہ سطور لکھتے وقت میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہورہا ہے، میں آپ کا بدترین بدخواہ ہوتا، اگر اس مہلک نظریہ کے متعلّق میں اپنے دل کی بات آپ کے سامنے بیان نہ کرتا۔ قرآن اور حدیث میں حرمتوں کے متعلّق "اہون" اور "غیر اہون" کا تصوّر ضرور پایا جاتا ہے مگر "ابدی" اور غیر ابدی کا نہیں۔ مجھے یُوں محسُوس ہوتا ہے جیسے یہ دروازہ کھول کر ہم نے تجدّد پسندوں کو دین کی پامالی کا اِذنِ عام دے دیا ہے۔ غیر ابدی حرمتوں کی لکھی ہُوئی فہرست تو کہیں درج نہیں۔ ہوگا یہی کہ جو شخص یا گروہ اپنی ضرورتوں اور مصلحتوں کے تحت چاہے گا کسی حرمت کو ابدی ٹھہرالے گا۔ آخر کسی حرمت کو غیر ابدی ٹھہرانے کا حق ہمیں ہی تو ارزانی نہیں ہُوا۔ دُوسرے بھی تو اس سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ ایسی صُورت میں ہم یہ تو کہہ سکیں گے کہ جن ضرورتوں اور مصلحتوں کی خاطر تم ایک حُرمت کو جائز قرار دے رہے ہو، یہ ضرُورتیں اور مصلِحتیں معتبر نہیں مگر اس کا کیا جواب ہوگا جب پلٹ کر کسی نے یہ کہہ دیا کہ یہ اجتہادی مسئلہ ہے۔ آپ کے نزدیک یہ مصلِحتیں غیر معتبر ہیں۔ ہمارے نزدیک معتبر اور جہاں تک نظریہ کا سوال ہے وہ خود آپ ہی کا عطا کردہ ہے۔ اس لیے ہم نے اپنے اجتہاد پر عمل کرتے ہُوئے بھی

"سو حرمتوں کو حُکم دیا ہے جواز کا"

تو ہم اس کے لیے ثواب کے اُمیدوار ہیں۔ کیونکہ مجتہد کے نامۂ اعمال میں غلط اجتہاد پر بھی

میں پیش ہونے والے اس نئے نظریہ نے مجھے ہلا کر رکھ دیا ہے اور میں یہاں تک سوچنے لگا ہوں کہ کیا آپ کا پہلا نظریۂ حکمتِ عملی انھی مضمرات کا حامل تو نہ تھا ؟

نظریئے کی تائید میں دلیل اور سند کی بھی ضرورت تھی۔ اس مقصد کے لئے آپ نے خود سرکارِ رسالتمآب حضور نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ گرامی کو ملوّث کر دیا۔ فرمایا کہ اس طرح کا کام خود پہلی اسلامی تحریک" کے قائد جناب رسولِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کیا ہے۔ اصول تو انھوں نے یہ دیا کہ مساوات ہونی چاہیئے۔ کسی عربی کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت نہیں مگر جب خلافت کا مسئلہ سامنے آیا تو آپ نے اس عصبیت کے پیشِ نظر جو ابھی تک قریش کے لوگوں میں موجود تھی، حکمت اور مصلحت کی خاطر یہ فرما دیا کہ ــــ الائمۃ من القریش۔ امام (یعنی خلفاء) قریش میں سے ہوں گے۔

اسی طرح ہر چند کہ امیدواری اسلام میں حرام ہے لیکن حکمت اور مصلحت کے تحت ہم اسے اپنا سکتے ہیں۔" اسلامی تحریک کے قائدِ اوّل نے ایسا کیا ہے تو آج کی اسلامی تحریک کا قائد ہونے کی حیثیت سے مجھے بھی اس کا حق حاصل ہے ــــ اس نظریئے کے ذریعے سے قرآن و سنت میں جو تحریف کی گئی ہے، حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دامنِ اقدس کو جس طرح داغ دار کیا گیا ہے غیر مسلموں کو آنحضورؐ کی ذاتِ گرامی پر اتہامات تراشنے کا جو موقع دیا گیا ہے اور "الائمۃ من القریش" کی یہ غلط تشریح پیش کر کے دین سے ناواقفیت کا جو ثبوت دیا گیا ہے، اس پر تو ہم تفصیل سے اپنی زیرِ طبع کتاب "سیاسی مذہب" میں روشنی ڈالیں گے۔ سردست قارئین اتنا ہی اندازہ کر لیں ــــ کہ جماعت اسلامی کے امیر المؤمنین اپنی غلطیوں کے جواز کے لیئے کس طرح قرآن و حدیث کے ساتھ کھیلنے سے بھی نہیں چوکتے ؟

نقطۂ نظر پر سوچ رہی ہے اور امکان غالب اِس کا ہے کہ مس فاطمہ جناح کی حمایت کا فیصلہ کیا جائے گا۔ مَیں اس انکشاف پر سراسیمگی کا شکار ہوگیا اور جماعت کے فیصلے کے اِنتظار میں اس بیان کو واپس لے لیا۔

مجھے بعد میں یہ جان کر خوشی ہُوئی کہ آپ نے جیل سے مرکز جماعت کو یہ ہدایت بھجوائی ہے کہ اس مسئلہ پر ہرگز متحدہ حزبِ اختلاف کا ساتھ نہ دیا جائے۔ آپ کی گزشتہ تحریروں کی روشنی میں امید بھی اس بات کی تھی۔ لیکن جب مجلسِ مشاورت میں جیل سے آئی ہُوئی آپ کی وہ تحریر پڑھ کر سُنائی گئی (جسے بعد ازاں لفظ بلفظ مجلسِ مشاورت کی قرار داد کی صُورت میں اخبارات کو ارسال کر دیا گیا) تو میرے حُسنِ ظن کو انتہائی ٹھیس

مجلسِ مشاورت کی آزادی رائے کو سلب کر لیا۔ مجھے اس اجلاس کے وقت کے بارے میں دیدہ دانستہ طور پر غلط اطلاع دی گئی تاکہ میں اس قرارداد پر اعتراض نہ اٹھا سکوں۔

قرارداد اخبارات میں شائع ہوگئی تو جماعتی فیصلے کی حیثیت سے مجبوراً مجھے اسے تسلیم کرنا پڑا۔ میں ان دنوں امیر جماعتِ اسلامی حلقۂ لاہور تھا۔ شہاب کو تقریباً جماعتی آرگن کی حیثیت حاصل تھی اور اپنی منصبی ذمہ داری کے تحت مجھے بولنا بھی پڑتا تھا۔ اور لکھنا بھی۔ جماعت میں رہتے ہوئے یہ ممکن نہ تھا کہ میں اس گمراہ کن قرارداد کی تائید نہ کرتا، اور اگر اس مرحلے پر جماعت سے علیحدہ ہوتا تو یہ لوگ پروپیگنڈہ کا طوفان اٹھا دیتے کہ محترمہ فاطمہ جناح کے مقابلے میں مجھے صدر ایوب نے خرید لیا ہے اور اس وقت میں محترمہ کا ساتھ بھی دینا چاہتا تھا۔ اس لئے میں نے اُس وقت جماعت سے مستعفی ہونے کو مناسب نہیں سمجھا البتہ اس بات کا قلق مجھے برستور رہا کہ میں نے مودودی صاحب کے ابدی اور عزیز ابدی حرمتوں کے غلط اور گمراہ کُن نظریئے کی تائید کیوں کی۔ مودودی صاحب کے نام اس خط میں میں نے اسی خلافِ ضمیر کام پر اظہارِ ندامت کیا ہے۔

نظامِ حکومت کی اِصلاح آپ سے آپ یُوں ہوگی جیسے سنگترے کے بیج سے سنگترے کا درخت اور پھر اس درخت سے سنگترے کا پھل پیدا ہوتا ہے۔ اس طبعی عمل کے طور پر اِسلامی حکومت اسی اِصلاح یافتہ معاشرے سے ظہُور پذیر ہوگی۔ یہ تصوّر اگر جماعت کی نگاہوں سے اوجھل ہوتا تو کسی اہم مرحلے پر اسے اُجاگر کرنے کے بعد پھر سے زیرِ عمل لایا جاسکتا ہے لیکن دُوسرے بہت سے اصحابِ قلم کے علاوہ خود آپ نے پچھلے آٹھ دس برس میں جماعت کو جو فکری غذا دی ہے اور جس طرح پہلے دُوسرے اور تیسرے مرحلے کا تصوّر دے کر جماعت کے کارکنوں کو یہ باور کرایا ہے کہ جماعت جو بھی پالیسی اِختیار کر رہی ہے وہ اسی تصوّرِ اقامتِ دین ہی کا نتیجہ ہے جو آپ نے شروع میں پیش فرمایا تھا۔ اس کے بعد جماعت کے کارکنوں کو پھر سے اِصلاحِ ذات اور اِصلاحِ معاشرہ کے کاموں پر لگا دینے کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔ مزید برآں ہم نے پچھلے چند سالوں میں بالعموم اور صدارتی اِنتخاب میں بالخصوص جس قسم کی اپوزیشن کا کردار ادا کیا ہے، اربابِ اِقتدار کو اپنا حریف بنایا اور خود جس طرح ان کے حریف بنے ہیں، اس کے بعد داعیٔ دین کی حیثیت سے ہمارے لیے مُلک میں کام کرنے کی کوئی صُورت موجُود نہیں۔ اس پہلو سے میری مایُوسی اس وجہ سے اور بھی زیادہ بڑھ گئی ہے۔ کیونکہ ہم نے ۱۹۶۹ء کی اِنتخابی پالیسی سے لے کر عورت کے مسئلہ صدارت تک ہر متضاد بات کے لیے جس طرح نصوصِ قرآن و حدیث کو پیش کیا ہے، اس کے بعد اس مُلک میں کوئی ذی فہم آدمی ہماری پیش کردہ دینی اور اصلاحی دعوت پر اعتماد نہیں کرسکتا۔ تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں۔ تضادات کا شکار ہو جانے کے سارے اَدوار آپ سے بڑھ کر کس پر روشن ہوں گے۔ پہلے ہم نے اُمیدواری کو حرام قرار دیا۔ اِس کے لیے صحابہ تک کی کسی جلیل القدر شخصیت میں میں اُمیدواری کا کوئی پہلو ہمارے سامنے پیش کیا گیا تو ہم نے اپنی اجتہادی رائے کو نص کا درجہ دے کر اُس پر تنقید کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا مگر اب ہم اپوزیشن کے ساتھ

اب انھی کو جمہوریت کا سرپرست کہتے ہیں ـــــ میں یہ عرض نہیں کرنا چاہتا کہ ـــــ ہماری ان باتوں میں سے کون سی بات صحیح تھی اور کون سی غلط۔ یہ تو مشتے نمونہ از خروارے ہے اور یقین مانیے انتہائی دُکھ کے ساتھ میں نے جماعتی تاریخ کی طرف یہ اشارے کیے ہیں۔ عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ جب اتنے واضح تضادات کو وقت کی گردش کے ساتھ ساتھ ہم اسلامی اور دینی سمجھ کو چھوڑتے اور اختیار کرتے رہے ہیں تو اب "ترک واختیار" کے ان مظاہروں کے بعد اپنے ارکان کے سوا کون ہمارے دینی فکر پر بھروسہ کرے گا؟

۲ ـــــ اگر ہم دین کے لیے کوئی کام نہ کر سکتے تو ہمارے لیے ایک سیاسی پارٹی کی حیثیت سے کام کرنے کا دُوسرا میدان باقی تھا مگر میں نہایت افسوس کے ساتھ عرض کر رہا ہوں کہ ہماری تنظیم کے قواعد اور اس کی موجودہ ہیئت اس کے لیے سخت غیر موزوں اور نامناسب ہے۔ ہمارے نظام میں محدُود رُکنیت کا جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے، اس کی وجہ سے ہمارے ارکان کی تعداد غالباً ابھی تک ڈیڑھ ہزار سے متجاوز نہیں ہو سکی۔ اس میں بھی ہر پندرھواں رُکن تنخواہ دار ہمہ وقتی دسواں رکن ہے۔ جماعت کے پُورے درو بست اور قیادت پر انھی ہمہ وقتی اصحاب کا قبضہ ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ان میں انتہائی مخلص لوگ شامل ہیں۔ لیکن جیسا کہ آپ کی طرف سے قیم حلقہ ہونے کی بالاصرار دعوت پر میں نے عرض کیا تھا کہ ہمہ وقتی ہونے کے بعد تنخواہ اور معاوضہ کی شرح سے کام کی پیمائش ہوتی ہے۔ اس لیے غریب کارکنوں کو اپنے دفاع میں بہت کارگزاری بیان کرنا پڑتی ہے۔ معترض ارکان کا جواب دینے کے لیے حامی ارکان ڈھونڈنے پڑتے ہیں اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بے لوث تنخواہ دار قیادت بھی سازشوں اور گروپ بندیوں کا شکار ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں معیار بدقسمتی سے یہ نہیں کہ کون اہل ہے جسے اعزازی طور پر ہی سہی جماعت کی قیادت سونپ دی جائے۔ معیار یہ ہے کہ کون فارغ یا معاشی پریشانیوں میں مبتلا ہے، جسے ہمہ وقتی بنا کر قائد بنا دیا جائے۔ آپ ناراض نہ ہوں تو عرض کروں کہ آج جماعت کی

اس سے کوئی رُکن اختلاف کرے تو جماعت اسے باہر کا راستہ دکھا دیتی ہے۔

یہی صورت ہمارے ہاں قیادت و امارت کی ہے۔ ۱۹۴۱ء سے لے کر اب تک ہمارے ہاں کوئی ایک فرد بھی جماعتی تربیت سے ایسا تیار نہیں ہُوا جو آپ کے بعد جماعت کی قیادت کر سکتا ہو، یا جماعت کے اندر اور باہر اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے نمایاں اور ممتاز ہو۔ جس جماعت کی جمہُوری اور عددی صُورتِ حال یہ ہو، جس کی قیادت اوّل سے آخر تک تنخواہ دار ہو، جس میں اظہارِ رائے پر قدغن ہو، جس میں مٹھی بھر لوگ ووٹ کا حق رکھتے ہوں، جس میں آپ کی پیش کردہ علمی اور دینی آراء سے اختلاف کرنا جماعت کی مخالفت کرنے کے مترادف ہو، اس میں ایسا آدمی کیسے داخل ہو سکتا ہے جو خود سوچنے سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ ایسا شخص تفصیلات معلوم کیے بغیر شامل بھی ہو جائے تو وہ یہاں ٹِک نہیں سکے گا۔ آپ کی تو پُورے عالم کی وسیع سیاسیات پر نظر ہے۔ آپ سے بڑھ کر کون جان سکتا ہے کہ جس جماعت میں فقط وہی لوگ چل سکتے ہوں جو آمنّا و صدقنا اور احسنت و مرحبا کی صدا بلند کرنے ہی کو سعادت سمجھیں، وہ کبھی ایک زندہ قوم کی راہنمائی نہیں کر سکتی۔

۳۔ تیسری صورت یہ تھی کہ ہم سیاست اور اصلاح و تزکیہ دونوں اہم کاموں سے دستکش ہو کر رفاہِ عامہ کا منصوبہ بناتے اور خدمتِ خلق کے لیے کام شروع کر دیتے مگر سالہا سال کے غور و فکر اور مُطالعہ و مشاہدہ سے نظریہ آتا ہے کہ ہم اس میدان کے بھی مرد نہیں۔ ہم نے اپنے کارکنوں کو (الّا ماشاء اللہ) جو ذہن دیا ہے وہ یہ ہے کہ خدمتِ خلق کا کام سیاسی نتائج حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے اور بس۔ ہم نے ہمیشہ اپنے شفاخانوں اور خدمتِ خلق کے دُوسرے کاموں کو جماعت کے اثر و رسُوخ اور سیاسی مواقع کے حصُول کے پیمانے سے ناپا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کسی سیاسی اور ہنگامی مقصد کے بغیر ہم خدمتِ خلق کا کوئی بھی منصُوبہ زیرِ عمل نہیں لا سکتے۔

علمِ دین تو بڑی بات ہے اُردو کے چند فقرے بھی صحیح نہیں بول سکتے۔ میں چونکہ ایسے لوگوں کی سربراہی سے اختلاف کرنے کا قصوروار ہوں، ان خرابیوں کا ناقد ہوں۔ چودھری صاحب کی شائع کردہ ایک کتاب "فقہ السنہ" پر بے لاگ تبصرہ کر چکا ہوں۔ اس لیے مجھے اس جرم کی سزا مرکزی شوریٰ کے ہر اجلاس پر بھگتنی پڑتی ہے۔ جگہ جگہ میرے بارے میں نجویٰ کیا جاتا ہے، جس کی صفائی پیش کرتے کرتے اب قریب قریب عاجز آچکا ہوں۔ یہ صورتِ حال جو آپ سے بھی مخفی نہیں، سخت افسوس ناک ہے۔ ہماری تنظیم میں یہ رجحانات ہمارے لیے سب سے بڑا خطرہ ہیں اور اس وقت ملک میں جو لوگ اگر ہمارے باہمی تعاون اور تعلقات کے مدّاح ہیں تو اس کا سبب یہ ہے کہ دُوسری جماعتوں کی طرح ہمارے اندرونی حالات خوش قسمتی سے اخبارات میں شائع نہیں ہوتے۔

اندریں حالات مَیں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں جماعت میں اپنے منصب اور ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاؤں۔ جماعت کے جلسہ ہائے عام سے خطاب نہ کروں، ایک معمولی رُکن کی حیثیت سے خدمت انجام دیتا رہوں تاکہ جماعت میں جو لوگ اپنی بیش قیمت صلاحیتیں خواہ مخواہ مجھے بدنام کرنے میں صرف کرتے رہتے ہیں ان کے لیے تسکینِ دل کا سامان فراہم ہو سکے۔"

یہ ۳۱ اکتوبر ۱۹۶۳ء کی تحریر ہے۔ آج تقریباً ڈیڑھ سال کے بعد ان خرابیوں میں اضافہ ہی ہُوا ہے کمی نہیں ہُوئی۔ باہمی عداوتیں ترقی پذیر ہیں۔ لین دین کے معاملات میں کارکن تو ایک طرف رہے، ہمارے راہنما تک افسوس ناک کردار رکھتے ہیں۔ امانتیں ضائع ہو رہی ہیں۔ عُشر اور زکوٰۃ کی رقوم خالص سیاسی اور انتخابی مہمّات

ہو، جس کے لیے معافی چاہتا ہوں۔ اب میری اپنی قوتِ فیصلہ شل ہے اور میں بے چینی سے آپ کے جواب کا منتظر ہوں۔ خدا کرے آپ غم و غصّہ کے بجائے شفقت کے ساتھ اس تحریر کا مطالعہ کریں اور مجھے اپنے جواب کے ذریعے اِس مایوسی سے نکلنے میں مدد فرمائیں۔

کوثر نیازی

لاہور — ۱۲ فروری ۱۹۶۵ء

فصل ـــــ ۵

میرا استعفیٰ

۱۹ فروری ۱۹۶۵ء

محترم و مکرم جناب مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

امیر جماعتِ اسلامی پاکستان

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ آپ کی طرف سے میرے خط محرّرہ ۱۲ فروری ۱۹۶۵ء کا جواب موصول ہوا۔ مجھے افسوس ہے کہ اپنے خط کے آخری حصّے میں مَیں نے جس خدشے کا اظہار کیا تھا کہ کہیں ان دردمندانہ معروضات پر غور کرنے کے بجائے آپ غصّے میں نہ آجائیں ـــ وہی ہُوا ـــ اور آپ نے مختصر جواب میں وہ سب کچھ کہہ دیا جو غصّے کی حالت میں کہا جاسکتا تھا۔

آپ نے فرمایا ہے کہ جماعت کی پالیسی اور حالات کے متعلّق ایک مدّت سے مَیں جس اضطراب میں مُبتلا تھا، اُس کے ہوتے ہُوئے مجھے بہت عرصہ پہلے جماعت سے مستعفی ہو جانا چاہیے تھا۔ آپ کا یہ ارشاد بظاہر قابلِ التفات نظر آتا ہے لیکن اگر آپ تھوڑی

محترم مولانا! میرا ماضی کا طرزِ عمل تو یہ رہا ہے کہ مَیں نے جماعت کو حق کا علمبردار سمجھا تو اس کی ایک ایک بات کی تبلیغ و تائید میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی اور جن لوگوں نے جماعت کی مخالفت کی، ان کے حملوں سے اسے محفوظ رکھنے کے لیے اپنی تمام توانائیوں کو نچوڑ دیا اور اس سلسلے میں نہ تو کسی باجبروت قوّت سے مرعُوب ہُوا اور نہ اپنے تعلقاتِ عقیدت و محبّت اور اپنے دُوسرے احوال و ظروف کا لحاظ کیا۔ اب اگر مَیں اپنے سترہ سالہ تجربات کی بنا پر اس آخری فیصلے پر پہنچ چکا ہوں کہ جماعت فکری و عملی دونوں پہلوؤں سے صراطِ مستقیم سے بھٹک چکی ہے اور اس فیصلے کا اظہار میں اس لیے لوگوں کے سامنے کروں کہ جن ہزاروں افراد کو مَیں نے جماعت سے متعارف کرایا، کم از کم ان کے سامنے بری الذّمہ ہو جاؤں، تو میرا یہ طرزِ عمل کیوں للّٰہ و فی اللّٰہ اور حقیقی بہی خواہی پر مبنی نہیں ہوگا؟

مولانا مکرّم! یہ عجیب بات ہے کہ ایک طرف تو آپ تجدید و احیائے دین کا کام کرنے کے لیے اوّلین ضرورت یہ محسُوس فرماتے ہیں کہ صدیوں پہلے فوت ہونے والے اُن نفُوسِ قدسیہ پر شدید تنقید کریں جو تقویٰ، للّٰہیت، اخلاص اور دین کے لیے ایثار کرنے میں ضربُ المثل ہوں اور پھر اس ضرُورت کو پُورا کرنے کے لیے آپ مسلسل تصانیف شائع فرمائیں۔ لیکن اگر کوئی شخص دیانت داری سے مُسلسل تجربات و شواہد کے بعد آپ کے بارے میں یہ رائے قائم کرے کہ آپ کا طرزِ عمل غلط، دین کے خلاف یا مُسلمانوں کے لیے گمراہ کُن ہے اور وہ اپنی اِس رائے کو باقاعدہ دلائل کے ساتھ پیش کرے تو آپ اُس شخص کے بارے میں یہ فتویٰ صادر فرمادیں کہ یہ اخلاص اور للّٰہیت سے محروم ہو چکا ہے اور بعض "دوسرے" محرکات کے تحت یہ کام ہو رہا ہے۔

مولانا محترم! آپ نے بین السطور میں کچھ "دُوسرے محرکات" کا بھی ذکر فرمایا ہے۔ میں حیران ہوں کہ اس کے بارے میں کیا عرض کروں۔ جماعت کے احوال و کوائف سے آگاہی رکھنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ ۱۹۴۱ء سے لے کر اب تک جس کسی شخص نے (خواہ وہ کتنا ہی

بابِ دوئم

جماعتِ اسلامی اور حیاتِ ملّی

- آزادی اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے ——— ۴۵
- مولانا مودودی اور آزادی کی تحریک ——— ۴۸
- تحریکِ پاکستان اور مودودی صاحب ——— ۵۵
- تحریکِ پاکستان کی مخالفت ——— ۶۰
- مظلوم مسلمانوں سے اظہارِ برئیت ——— ۷۵
- جماعت کے خلاف مسلم لیگ کا ردِّ عمل ——— ۸۲
- قومی دشمن سے راہ و رسم ——— ۸۷

فصل ــــ ۱

آزادی
اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے

آزادی اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے اور اپنی قوم کو دُوسری قوموں کی غلامی سے نجات دِلانا پیغمبرانہ مشن ہے۔ قرآنِ حکیم بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرتِ مُوسیٰ اور حضرت ہارُون علیہما السّلام کو فرعون کے پاس بھیجا تو ایک مقصد یہ بھی تھا کہ وہ اپنی قوم بنی اسرائیل کو آزاد کرائیں اور اسے اپنے ہمراہ مصر کی اس سرزمین سے نکال کر لے جائیں جہاں وہ غلامی کے دن گزار رہی تھی[1] فاتیاہُ فقولا انّا رسولا ربّک فارسل معنا بنی اسرائیل ولاتعذّبھم

"تُم اس کے پاس جاؤ۔ پھر اس سے کہو کہ ہم دونوں تیرے پروردگار کے قاصد ہیں۔ سو تو ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو جانے دے اور انھیں دُکھ نہ دے ــــ"

قرآنِ حکیم کی اسی تعلیم کے پیشِ نظر ہندوستانی مُسلمانوں کے مذہبی اور سیاسی

[1] پارہ ۱۶، رکوع ۱۱، آیت ۴۷

کا مخالف تھا۔ لیکن جہاں تک برطانوی سامراج کے خلاف جہاد کرنے اور آزادئ وطن کے لیے تکلیفیں اُٹھانے کا تعلق ہے۔ ان حضرات کا بڑے سے بڑا مخالف بھی ان کی عظمت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہے۔ ان میں سے بعض نے اپنی اجتہادی غلطی کا اعتراف کر لیا اور بعض تقسیم کے بعد ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کے تحفّظ کے لیے بھارت ہی میں رہ گئے۔ قیامِ پاکستان کے بعد انھوں نے پاکستان کے خلاف کبھی لب کشائی نہیں کی اور نہ یہاں منتقل ہو کر اپنے مذہبی تقدّس کی بُنیاد پر انھوں نے کبھی حصُولِ اقتدار کے لیے کوشش کی۔

نجات دلانے کی جدّوجہد کسی قدر قیمت کی حامل نہ تھی۔

سامراج اپنے محکوموں پر جو ظلم ڈھا رہا تھا۔ ان سے غریب عوام کو بچانا کوئی ایسا خاص مسئلہ نہ تھا۔ وہ اقتصادی استحصال جسے حاکمِ اقلیت کے مٹھی بھر لوگ روا رکھ رہے تھے، کوئی ایسا قابلِ نفرت فعل نہ تھا جسے ختم کرنے کے لیے آزادی کا علم بلند کیا جاتا۔ وہ ایک طرف مسلم لیگ اور کانگرس کو لتاڑ رہے تھے اور دوسری طرف مُسلمان قوم کو یہ سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے کہ :

"مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرے نزدیک یہ امر بھی کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا کہ ہندوستان کو انگریزی امپریلزم سے آزاد کرایا جائے۔ انگریزی حاکمیت سے نکلنا تو صرف لا الٰہ کا ہم معنی ہوگا۔ فیصلہ کا انحصار محض اس نفی پر نہیں ہے کہ اس کے بعد اثبات کس چیز کا ہوگا۔ اگر آزادی کی یہ ساری لڑائی صرف اس لیے ہے اور مجاہدینِ حریت میں سے کون صاحب یہ جھوٹ بولنے کی ہمّت رکھتے ہیں کہ یہ اس لیے نہیں ہے کہ امپریلزم کے آلہ کو ہٹا کر ڈیموکریسی (جمہوریت) کے آلہ کو بُت خانہ حکومت میں جلوہ افروز کیا جائے تو مُسلمان کے نزدیک درحقیقت اس سے کوئی فرق بھی واقع نہیں ہوتا۔ لات گیا، منات آگیا۔ ایک جھوٹے خدا نے دوسرے جھوٹے کی جگہ لے لی۔"

—— (سیاسی کشمکش حصّہ سوم ص ۱۲۷)

اس زمانے میں مولانا صاحب کے نزدیک کسی ملک میں ایک آزاد مسلمان حکومت کا جمہوریت کی بُنیاد پر قیام کوئی ایسی مُسرّت کی بات نہ تھی۔ وہ اپنے مخصوص نظریات کی خیالی دُنیا میں ایسے گُم تھے کہ انھیں یہ بھی احساس نہ رہا کہ میری اس طرح کی تحریروں سے بدنصیب ہندی مُسلمانوں کی مدّتِ غلامی اور طویل ہوسکتی ہے۔ تمام مُسلمان اپنے اپنے رنگ میں غلامی کی زنجیریں کاٹنے میں مصروف تھے مگر مولانا مودودی کا کہنا یہ تھا کہ :

آزادئ وطن کے لیے جتنی مسلم جماعتیں کام کر رہی تھیں مولانا مودودی صاحب نے اُن کے نیچے اُدھیڑ کر رکھ دیئے، ــــ فرمایا:

"اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی جو مختلف جماعتیں اسلام کے نام سے کام کر رہی ہیں۔ اگر فی الواقع اسلام کے معیار پر ان کے نظریات، مقاصد، اور کارناموں کو پرکھا جائے تو سب کی سب جنسِ کاسد نکلیں گی۔ خواہ مغربی تعلیم و تربیت پائے ہوئے سیاسی لیڈر ہوں یا علمائے دین اور مفتیانِ شرعِ متین دونوں قسم کے راہنما اپنے نظریئے اور پالیسی کے لحاظ سے یکساں گم کردہ راہ ہیں۔ دونوں راہِ حق سے ہٹ کر تاریکیوں میں بھٹک رہے ہیں۔"

ــــ ("مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" حصہ سوم ص۱۲۵)

مولانا کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ انگریزی سامراج کے خلاف جہاد کرنے کے بجائے اسے پیار اور محبت سے سمجھایا جائے۔ کیونکہ اُن کے نزدیک یہ کوئی قابلِ اعتراض بات نہ تھی کہ وہ سات سمندر پار سے آکر ہندوستان پر کیوں حکومت کرتا رہا ہے۔ انھیں خطرہ تھا کہ انگریز کے خلاف مسلمانوں کی سیاسی جدّوجہد تیز کر دی گئی تو اس کے نتیجہ میں کہیں انگریز اسلام کی طرف سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے دِل کا دروازہ نہ بند کر لے۔ اس وقت جب اہلِ وطن انگریز کو نکالنے کے لیے سر پر کفن باندھ کر میدانِ عمل میں کُود چکے تھے، مولانا ان کے سامنے یہ وعظ فرما رہے تھے کہ:

"ــــ پھر یہ انگریز اور ہندوستانی کے درمیان قومی و وطنی عداوت اور تعصّب کی آگ بھڑکانے میں حصّہ لیتے ہیں۔ حالانکہ اسلام کی نگاہ میں انگریز اور ہندوستانی دونوں انسان ہیں۔ وہ دونوں کو یکساں اپنی دعوت کا مخاطب بناتا ہے۔ اس کا جھگڑا انگریز سے اس بات پر نہیں ہے کہ وہ ایک مُلک کا باشندہ ہو کر دوسرے مُلک پر حکومت کیوں کرتا ہے بلکہ اس بات پر ہے

انحصار ہے۔ نہ ہندوؤں سے ہمارا کوئی قومی جھگڑا ہے۔ نہ انگریزوں سے وطنیت کی بنیاد پر ہماری لڑائی ہے۔ نہ ان ریاستوں سے ہمارا کوئی رشتہ ہے، جہاں نام نہاد مسلمان خدا بنے بیٹھے ہیں[1]۔ نہ اقلیت کے تحفظ کی ہمیں ضرورت ہے نہ اکثریت کی بنیاد پر ہمیں قومی حکومت مطلوب ہے۔"

مولانا کو بجا طور پر اندازہ تھا کہ انگریز کے راج میں اسلام کے نام پر سیری مریدی کا جدید نظام قائم کرنے میں انھیں زیادہ سہولتیں حاصل ہوں گی۔ لیکن اگر کوئی مسلم حکومت قائم ہو گئی تو ظاہر ہے وہ مسلمانوں کو کافر بنانے کی یہ مہم جاری رکھنے میں قدم قدم پر مزاحم ہو گی اور وہاں چونکہ صرف مسلمان آباد ہوں گے اس لیے ایسی فضا میں اسلام کے نام پر من گھڑت نظریئے پیش کرنے پر سخت احتساب ہو گا۔ وہ محسوس کر رہے تھے کہ مسلمانوں کی آزاد قومی حکومت کے مقابلہ میں موجودہ انگریزی حکومت اقامتِ دین کے پروگرام کے لیے مفید ثابت ہو گی۔ انھوں نے لکھا:

"—— اس نام نہاد "مسلم حکومت"[2] کے انتظار میں اپنا وقت ضائع یا اس کے قیام کی کوشش میں اپنی قوت ضائع کرنے کی حماقت آخر ہم کیوں کریں۔ جس کے متعلق ہمیں یہ معلوم ہے کہ وہ ہمارے مقصد کے لیے نہ صرف غیر مفید ہو گی بلکہ کچھ زیادہ ہی سدِ راہ ہو گی۔"

—— (مسلمان کی موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم ص ۲۲۲)

مودودی صاحب کی تحریروں کے ان چند اقتباسات سے یہ بات آپ سے آپ

---

[1] ظاہر ہے کہ اس فلسفہ کی رُو سے اگر قیامِ پاکستان کے بعد بھارت نے حیدر آباد دکن اور جوناگڑھ وغیرہ کو ہڑپ کر لیا تو ہمیں اس کا کیوں دُکھ ہو؟

[2] واضح رہے کہ پاکستان کو نام نہاد مسلم حکومت لکھنے پر بھی مودودی صاحب مطمئن نہیں ہوئے۔ انھوں نے "مسلم حکومت" کے الفاظ پر کاٹے لگا دیئے۔

فصل — ۳

تحریکِ پاکستان اور مودودی صاحب

مسلمانوں کی جداگانہ قومیت اور تحریکِ پاکستان کے سلسلے میں مودودی صاحب کے ذہنی اور عملی سلوک کی داستان بھی بڑی دردناک ہے۔

برِّصغیر پاک و ہند میں سرسیّد کے بعد علّامہ اقبال نے سب[1] سے پہلے مُسلمانوں کی جُداگانہ قومیت کا تصوّر اُجاگر کیا۔ انھوں نے واشگاف الفاظ میں اعلان کیا کہ اِسلام میں قومیت، وطن، نسل، رنگ اور زبان کی بُنیاد پر نہیں دین کی بُنیاد پر تشکیل پاتی ہے۔ اس لیے ہندوستان میں ایک قوم نہیں دو قومیں بستی ہیں اور ان دونوں کا تصوّرِ حیات ایک

---

[1] اس بحث کو پڑھتے ہوئے جماعتِ اسلامی کے ایک راہنما کا یہ دعوی پیشِ نظر رکھیے جو روزنامہ "حریت" کراچی مورخہ ۱۶ ارجنوری ۷۰ء کے صفحہ نمبر ۷ کالم نمبر ۳ میں ان لفظوں میں شائع ہوا ہے کہ:

"ہندوؤں نے انگریزوں سے مل کر مسلمانوں کے گرد ایک مضبوط حصار قائم کر لیا جسے قائدِ اعظم کی مسلم لیگ میں شمولیت سے قبل مولانا مودودی نے توڑنے کی کوشش کی علامہ اقبال اٹھے اور پھر قائدِ اعظم نے اپنے کردار کی انتہائی بلندیوں کیساتھ بالآخر اس حصار کو توڑ دیا۔"

کا جو تصوّر پیش کیا ہے، وہ اسلامی نقطۂ نظر سے صحیح بھی ہے اور اس کی زوردار وکالت کی جائے تو اس حلقے کی قیادت بھی ہاتھ آسکتی ہے۔ اس لیے اُنھوں نے ۱۹۳۶ء میں ایک ایک سلسلۂ مضامین شروع کیا جو دسمبر ۱۹۳۸ء تک ان کے رسالہ "ترجمان القرآن" میں جاری رہا۔ ان مضامین میں جداگانہ قومیت کے پُرجوش مبلّغ اور ہندو ازم کے زبردست ناقد کی حیثیت سے انھوں نے کانگرس اور کانگرسی علما پر زبردست تنقید کی۔ بڑے مدلّل انداز میں ثابت کیا کہ اگر متحدہ قومیت کی بنیاد پر ہندوستان آزاد ہوگیا تو نہ مسلمان باقی رہیں گے نہ اسلام، ان مضامین میں انھوں نے آزادئ ہند کے لیے جو تین خاکے پیش کیے ان میں تقسیم وطن کے رنگ میں ہندو مسلم کنفیڈریشن کی تجویز بھی شامل تھی۔ رسالہ "ترجمان القرآن" کی اکتوبر، نومبر، اور دسمبر ۱۹۳۸ء کی اشاعتوں میں یہ خاکے آج بھی ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں۔

پہلا خاکہ یہ تھا کہ:—

"— دو یا زائد قوموں کے (اس) مُلک میں ایک جمہوری ریاست بنانے کے لیے اسے وفاق (کنفیڈریشن) بنا دیا جائے۔ وہ ایک قوم کی ریاست نہ ہو۔ بلکہ متوافق قوموں کی ایک ریاست ہو۔"

دُوسرا خاکہ یہ تھا کہ:—

"— مختلف قوموں کے الگ الگ حدُود ارض مقرّر کر دیئے جائیں جہاں وہ اپنے جمہوری اسٹیٹ بنا سکیں پچیس سال یا اس سے کچھ کم و بیش مدّت تبادلۂ آبادی کے لیے مقرّر کر دی جائے۔ ہر اسٹیٹ کو زیادہ سے زیادہ اندرُونی خود مختاری دی جائے"، وغیرہ وغیرہ۔

ان کا تیسرا خاکہ یہ تھا کہ:—

"— ہماری قومی ریاستیں الگ بنائی جائیں اور ان کا علیٰحدہ وفاق ہو۔ اسی طرح ہندو ریاستوں کا بھی ایک جُداگانہ وفاق ہو اور پھر ان دو یا زائد وفاقی مملکتوں

کی بھی یہی شہادت ہے۔ ماہنامہ نگار کراچی نے نیاز فتحپوری نمبر نکالا تو اس کے لیے مولانا ابُوالخیر صاحب کو بھی مضمون لکھنے کی دعوت دی گئی۔ کیونکہ "مودودی برادران" نے ایک عرصہ تک نیاز مرحوم کا فیضِ صُحبت اٹھایا تھا۔ اس کے جواب میں سیّد ابُوالخیر صاحب نے جو کچھ لکھا وہ نگار ستمبر ۱۹۶۳ء میں شائع ہُوا ہے۔ اس میں اُنھوں نے ضمناً اپنے چھوٹے بھائی امیر جماعتِ اسلامی پاکستان کا بھی ذکر کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

" جی ہاں! نیاز اور بھوپال پر لکھنے والا ایک یہی نافرجام رہ گیا ہے ——
کاش ..... ! — قمر کو مرحوم ہُوئے ایک زمانہ بیت گیا —" ابوالاعلیٰ"
"بعد از خدا بزرگ" ہو گئے۔ اور یہ نافرجام۔

—— (نگار ستمبر ۶۳ء صـ۶۳)

ظاہر ہے یہ مزاج اور سرشت رکھنے والا بزرگ "قیادت کاملہ" سے کم کسی چیز پر راضی نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر ادھر مشکل یہ ہُوئی کہ مُسلمان قوم مودودی صاحب کو اچھا مذہبی مضمون نگار سمجھنے کے باوجود "محمد علی جناح" کے گرد جمع ہو گئی اور تاجِ قیادت اُن کے سر پر رکھ دیا گیا۔ مودودی صاحب نے یہ صورتِ حال دیکھی تو آپے سے باہر ہو گئے۔ کہاں اَب تک وہ مُسلم لیگ کی ہم نوائی میں کانگرس اور کانگرسی علماء کو لتاڑ رہے تھے۔ مُسلمانوں کی جُداگانہ قومیت کے مبلّغ تھے اور کہاں اب خود مسلم لیگ، اس کی قیادت اور جُداگانہ قومیت کی بنیاد پر مانگے جانے والے پاکستان پر برسنے لگے اور ایسے برسے کہ برستے ہی چلے گئے۔ پاکستان کے بننے کے بعد بھی انھوں نے مُسلم لیگ کی یہ خطا معاف نہ کی اور ہمیشہ قائدِ اعظم پر ایک حریف کی حیثیت سے وار کرتے رہے۔ جماعتِ اسلامی کے لوگ چاہے مودودی صاحب کی اس تنقید کو مصلح کی تنقید کہتے رہیں لیکن آگے چل کر جو اقتباسات سامنے آئیں گے انھیں دیکھ کر ہر شخص یہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ یہ ایک مصلح کی تنقید ہے یا حریف کی طرف سے زہر میں بُجھے ہُوئے تیر۔

"عوام کے اصرار پر" اس کی مطلق العنان "امارت" کا بوجھ اپنے مضبوط کندھوں پر اُٹھالیا۔[1]

مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصّہ سوم کے بارے میں جماعتِ اسلامی اور اس کے امیر کا تازہ ترین مؤقف یہ ہے کہ یہ مضامین قراردادِ پاکستان کے منظور ہونے سے پہلے لکھے گئے تھے۔ قراردادِ پاکستان منظور ہوجانے کے بعد مودودی صاحب نے پاکستان کے خلاف کوئی بات نہیں کہی۔ ہم عرض کریں گے کہ یہ دونوں باتیں بالکل غلط ہیں۔ ادھوری سچائی ان میں صرف اتنی ہے کہ یہ مضامین ۳۹ء اور ۱۹۴۰ء کے اوائل میں ۲۱ اپریل ۱۹۴۰ء سے پہلے لکھے گئے تھے لیکن جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے انھیں کتابی صورت میں ۱۹۴۱ء میں پیش کیا گیا اور مودودی صاحب نے اپنے روایتی زوردار اندازِ بیان میں کتاب پر مقدمہ لکھتے ہوئے صاف صاف اعلان کیا کہ وہ آج بھی ان خیالات کی صداقت پر مطمئن اور ان کے اشاعت کے علمبردار ہیں۔

"—— میں صرف حق کا دوست اور باطل کا دشمن ہوں۔ جس چیز کو میں نے حق سمجھا ہے اس کے حق ہونے کی دلیل بیان کردی ہے اور جسے باطل سمجھا ہے اس کے بطلان پر بھی دلائل بیان کر دیئے ہیں۔ اگر کوئی شخص مجھ سے اختلاف رکھتا ہو اور وہ دلیل سے میری رائے کی غلطی واضح کردے تو میں اپنی رائے واپس لے سکتا ہوں۔ رہے وہ حضرات جو صرف یہ دیکھ کر کہ کچھ ان کی پارٹی یا ان کی محبوب شخصیتوں کے خلاف کہا گیا ہے غضب ناک

---

[1] واضح رہے کہ جماعتِ اسلامی کی امارت کوئی ایسی ویسی امارت نہیں۔ اس کے بارے میں مودودی صاحب کا ارشاد یہ ہے کہ امیرِ جماعت یا اپنے مقامی امیر کے احکام و منشا سے بے اعتنائی برتنا ویسا ہی گناہ ہے جیسے کہ خدا اور رسول کے احکام اور منشا سے بے اعتنائی برتنے کا گناہ ہوتا ہے۔ (ترجمان القرآن مئی ۱۹۴۶ ص ۳۰)

۲ ـــــ "مُسلمانوں کی جماعت زیادہ تر ان ہی دو گروہوں پر مشتمل ہے۔ اِس لیے عموماً جو اجتماعی تحریکیں مُسلمانوں میں پھیل رہی ہیں۔ وہ اسلامی نقطۂ نظر سے غلط ہیں۔ ان کے مقاصد میں غلطی ہے۔ ان کے طریقِ کار میں غلطی ہے۔ ان کی بنیں غلطی ہے اور ان کی رُوحی کیفیت میں غلطی ہے۔"

(ایضاً صـ۵۸)

۳ ـــــ "شمال سے جنوب تک ہندوستان کے مُسلمانوں کے حالات کا جائزہ لے لیجیے۔ ہر جگہ آپ کو یہی نظر آئے گا کہ ایک نہ ایک شیطان اس قوم کی جان کا لاگو بنا ہُوا ہے اور پُوری مستعدی کے ساتھ اپنے کام میں منہمک ہے۔ جہاں مسلمانوں میں مذہب کے ساتھ ابھی دِل چسپی باقی ہے، وہاں یہ شیاطین مذہبیت کا جامہ پہن کر آتے ہیں اور دین کے نام سے ان مسائل پر بحثیں چھیڑتے ہیں اور نزاعیں برپا کراتے ہیں بلکہ بسا اوقات سر پھٹول تک نوبت پہنچا دیتے ہیں جن کی دین میں کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ اس طرح مُسلمانوں کا سارا مذہبی جوش ان کی اپنی تخریب میں صرف ہو جاتا ہے اور جہاں مذہب کی طرف سے کچھ سرد مہری پیدا ہو گئی ہے وہاں کچھ دوسری قسم کے شیاطین نمودار ہوتے ہیں اور وہ دنیوی ترقی و خوشحالی کا سبز باغ دِکھا کر مسلمانوں کو ایسی تحریکوں کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں جو اپنے مقاصد و طریقِ کار کے لحاظ سے قطعاً غیر اسلامی[1] ہیں۔" ـــــ (ایضاً صـ۷۷)

---

[1] اور یہ پہلے گزر چکا کہ مودودی کے نزدیک سبھی مسلم جماعتوں کے مقاصد اور طریقِ کار غیر اسلامی تھے۔ اس لیئے ان کی طرف بلانے والے لیڈر شیاطین قرار پائے۔ قائدِ اعظم بھی واضح طور پر اسی زمرے میں ہیں۔ اب یہ فیصلہ کرنا قوم کا کام ہے کہ قائدِ اعظم کی ذات پر ایسے حملے کرنے والے کو پاکستان سے کیا ہمدردی ہو سکتی ہے۔

میں اس کا مطلب یہ ہے کہ نبوّت ایک فضول چیز ہے۔ علمِ قرآن کے بغیر بھی
اِنسان صراطِ مستقیم پر چل سکتا ہے جو قرآن میں بتائی گئی ہے۔ حمیت جاہلیہ
کی اس سے بدتر مثال اور کیا ہو سکتی ہے۔"

——— (ایضاً حاشیہ ص۱۰۱)

۶ ——— " پھر وہ لوگ جو اس طائفے کے سرخیل ہیں۔ ان کا حال کیا ہے؟
ان میں سے اکثر کے گھروں میں آپ جایئے تو آپ کو
نماز کے وقت کوئی یہ بتانے والا نہ ملے گا کہ سمتِ قبلہ کدھر ہے اور اسبابِ
عیش و عشرت سے بھری ہوئی کوٹھیوں میں سے ایک جانماز بھی فراہم نہ ہو
سکے گی۔ سارے لیڈروں کو بٹھا کر اسلام کے بنیادی اور ابتدائی مسائل کے
متعلق امتحان لیجیے تو شاید کوئی صاحب دو فی صدی سے زیادہ نمبر نہ لے
سکیں گے۔ اِلّا ماشاء اللہ!"

——— (ایضاً ص۱۰۳)

۷ ——— " پھر جس لیڈر شپ کی اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے ضرورت ہے۔
وہ ایسی لیڈر شپ ہے جو ان اصولوں سے ایک اِنچ بھی ہٹنے کے لیے تیار
نہ ہو۔ جن کا بول بالا کرنے کے لیے اسلام اُٹھا ہے۔ خواہ اس ہٹ کی بدولت
تمام مسلمان بھوکے ہی کیوں نہ مر جائیں۔ بلکہ تہ تیغ ہی کیوں نہ کر دیئے جائیں۔
ہر معاملہ میں اپنی قوم کا فائدہ تلاش کرنے والی اور اصول سے بے نیاز ہو کر
ہر اس تدبیر کو جس میں قوم کو دُنیوی فلاح نظر آئے، اختیار کرنے والی
لیڈر شپ جس میں تقویٰ اور خدا ترسی کا رنگ مفقود ہو۔ اس مقصد کے
لیے قطعی ناکارہ ہے، جس پر اسلام نے اپنی نظر جما رکھی ہے۔"

——— (ایضاً ص۲۱۹)

ایک بھی ایسا نہیں جو اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرزِ فکر رکھتا ہو اور معاملات کو اسلامی نقطۂ نظر سے پرکھتا ہو۔ یہ لوگ مُسلمان کے معنی و مفہوم اور اس کی مخصُوص حیثیت کو بالکل نہیں جانتے۔"

اِن اقتباسات سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ مودُودی صاحب کو قیادتِ عظمےٰ سے کتنی کد تھی۔ شاید ہی کوئی ایسی ملفُوف گالی باقی رہ گئی ہو جو دِلّی کی اردوئے معلّیٰ میں قائدِ اعظم کو عطا نہ کی گئی ہو۔ اور چونکہ مُسلمان کسی اور لیڈر کو مان کر پاکستان کے لیے جدّوجہد کر رہے تھے اس لیے اس ضِد میں پاکستان کو بھی معاف نہ کیا گیا۔ مُسلمانوں کو بھی نہ بخشا گیا اور انھیں ایسے ایسے القاب سے نوازا گیا کہ انھیں پڑھ کر ہندو مہاسبھا کے موجودہ لیڈروں کو بھی معاف کر دینے کو جی چاہتا ہے۔ کہاں تو مودودی صاحب خود ہندو قومیت کی شدید مخالفت کر چکے تھے۔ آزادی کے تین لُولے لنگڑے خاکے پیش کرنے سے بھی انھوں نے دریغ نہ کیا تھا اور کہاں اب وہ ایک آزاد پاکستان کے بھی زبردست ناقدین گئے اور مسلم لیگ اور پاکستان پر پھبتیاں کسنے پر انھیں لُطف محسُوس ہونے لگا۔

سیاسی کشمکش حِصّہ سوم میں صفحہ ۶۹ پر ایک ذیلی عنوان ہے "پاکستانی خیال کے لوگ"۔ ان لوگوں پر مودُودی صاحب کی تنقید ۷۰ صفحہ تک کوئی نو صفحوں پر محیط ہے۔ اس تنقید میں انھوں نے مُسلم لیگی ذہن کے مسلمانوں کو کانگرسی ذہن کے مسلمانوں کی نسبت اسلام کے لیے زیادہ خطرہ قرار دیا ہے۔ مودُودی صاحب لکھتے ہیں:

"—— گویا جس طرح آزادی پسند لوگوں نے انگریزوں کو اپنا قومی حریف بنایا ہے۔ اسی طرح انہوں نے ہندوؤں کو بھی اپنا قومی حریف بنا لیا ہے اِس لحاظ سے یہ اور آزادی پسند حضرات ایک سطح پر کھڑے ہیں۔ لیکن جس چیز نے ان کی بہ نسبت ان کی روش کو اسلام کے لیے اور زیادہ مُضر بنا دیا

جس کو مُسلمان قوم کہا جاتا ہے۔ اس کا حال یہ ہے کہ اس کے ۹۹۹ فی ہزار افراد نہ اسلام کا علم رکھتے ہیں، نہ حق اور باطل کی تمیز سے آشنا ہیں نہ ان کا اخلاقی نقطۂ نظر اور ذہنی رویّہ اسلام کے مطابق تبدیل ہُوا ہے۔ باپ سے بیٹے اور بیٹے سے پوتے کو بس مُسلمان کا نام ملتا چلا آرہا ہے۔ اس لیے یہ مُسلمان ہیں۔ نہ انھوں نے حق کو جان کر اسے قبول کیا ہے۔ نہ باطل کو باطل جان کر اسے ترک کیا ہے۔ ان کی کثرتِ رائے سے ہاتھ میں باگیں دے کر اگر کوئی شخص یہ امید رکھتا ہے کہ گاڑی اسلام کے راستے پر چلے گی تو اس کی خوش فہمی قابلِ داد[1] ہے۔"

مودُودی صاحب اور ان کے اخبارات و جرائد آج یہ کہتے ہُوئے نہیں تھکتے کہ پاکستان کا مقصد اسلامی حکومت کا قیام تھا۔ اِس سلسلے میں بار بار قائدِ اعظم کے اقوال و ارشادات کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ لیکن جب تحریکِ پاکستان جاری تھی تو مودودی صاحب کو اسلامی حکومت قائم کرنے کے سلسلے میں، قائدِ اعظم کی کسی تقریر اور مُسلم لیگ کی کسی قرار داد میں کوئی وضاحت نظر نہیں آتی تھی۔ اِس سلسلے میں سیاسی کشمکش حِصّہ سوم کے صفحہ ۱۷۳ کا یہ حاشیہ ملاحظہ ہو:

"——— اس موقع پر یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مُسلم لیگ کے کسی ریزولیوشن اور لیگ کے ذمّہ دار لیڈروں میں سے کسی کی تقریر میں یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ ان کا آخری مطمحِ نظر پاکستان میں اسلامی نظامِ حکومت قائم

---

[1] قائدِ اعظم کے زمانہ میں جس نام نہاد مسلمان قوم کی کثرتِ رائے سے گاڑی اسلام کے راستے پر نہیں چل سکتی تھی۔ قائدِ اعظم کے بعد اب اسی مسلمان قوم کی کثرتِ رائے سے مودُودی صاحب امیر المؤمنین بننے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔

"—— بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ ایک دفعہ غیر اسلامی طرز ہی کا سہی، مُسلمانوں کا قومی اسٹیٹ تو قائم ہو جائے۔ پھر رفتہ رفتہ تعلیم و تربیت اور اخلاقی اصلاح کے ذریعے اس کو اسلامی اسٹیٹ میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ مگر مَیں نے تاریخِ سیاسیات اور اجتماعیات کا جو تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے اس کی بنا پر میں اس کو ناممکن العمل سمجھتا ہوں اور اگر یہ منصُوبہ کامیاب ہو جائے تو میں اس کو ایک معجزہ سمجھُوں گا۔"

—— (ایضاً صفحہ ۲۲)

مودودی صاحب پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام ہی کو معجزہ نہیں سمجھتے تھے، بلکہ ۱۹۴۶ء تک تو انھیں اس کے قیام ہی میں شک تھا۔ فروری ۴۶ء کے ترجمان القرآن میں ارشاد ہوتا ہے:

"—— جنّت الحمقاء میں رہنے والے لوگ اپنے خوابوں میں خواہ کتنے ہی سبز باغ دیکھ رہے ہوں۔ لیکن آزاد پاکستان (اگر فی الواقع وہ بنا بھی تو) لازماً جمہُوری لادینی اسٹیٹ کے نظریہ پر بنے گا۔"

ایک اور موقع پر ارشاد فرمایا:

"—— آپ کی سب سے بڑی قومی مجلس مسلم لیگ جس کو نو کروڑ مسلمانوں کی نمائندگی کا دعویٰ ہے۔ ذرا اس کو دیکھیے کہ اس وقت وہ کس روش پر چل رہی ہے۔ جنگ کے موقع پر جو پالیسی لیگ نے اختیار کی ہے، وُہ اصُول پرستی کے ہر نشان سے خالی ہے۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ درحقیقت یہی پالیسی مُسلمانوں کے ذہن کی ترجمانی کرتی ہے تو اس کے آئینے میں ہر صاحبِ نظر آدمی دیکھ سکتا ہے کہ ان نام نہاد مُسلمانوں پر پُوری طرح اخلاق کی موت وارد ہو چکی ہے۔" —— (سیاسی کشمکش حصّہ سوم صفحہ ۲۹)

کرنے کے بجائے کنی کاٹ جاتے ہیں۔ جن کا حال[1] یہ ہے کہ یورپ میں سرکارِ برطانیہ کو جنگ کا خطرہ پیش آتا ہے تو سب سے پہلے آگے بڑھ کر اپنی وفادارانہ خدمات پیش کرتے ہیں۔ ایسے لیڈروں سے اگر مسلمان یہ توقع باندھے بیٹھے ہیں کہ یہ ان کی کشتی بھنور سے نکال لیں گے تو میں پیش گوئی کرتا ہوں کہ ان کی جو کشتی ہے۔ وہ ڈوب کر رہے گی۔"

۱۹۴۶ء کا زمانہ وہ زمانہ ہے جب اکھنڈ بھارت یا پاکستان؟ کے موضوع پر الیکشن ہونے والے تھے۔ تحریکِ پاکستان اپنے پورے عروج پر تھی۔ عالم و عامی صالح و خاطی، ہر مسلمان "لے کے رہیں گے پاکستان" کا نعرۂ حق بلند کر رہا تھا۔ مگر ترجمان القرآن کا مدیر اس زمانے میں بھی مسلم لیگ اور اس کے رہنماؤں پر عقب سے وار کرنے میں مصروف تھا۔ اور انہیں علی الاعلان اسلام دشمن قرار دے رہا تھا۔ فروری ۱۹۴۶ء میں آپ نے لکھا:

"مسلم لیگ مسلمانوں کو اسلام اور اس کی تہذیب اور اس کے احکام کی اطاعت سے روز بروز دور تر لیے جا رہی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عام مسلمانوں کے جذبات بھڑکانے کے لیے اس میں اسلام کا نام بہت لیا جاتا ہے لیکن یہ چیزیں صرف سطح بین لوگوں کو دھوکہ میں ڈال سکتی ہیں۔ لیگ کی قیادت اس کی پالیسی کی تشکیل، اس کے پورے نظام کی کارفرمائی، ایک ایسے طبقے کے ہاتھ میں ہے جو زندگی کے جملہ معاملات میں دینی کی بجائے دنیوی نقطۂ نظر

---

[1] مسلم لیگی قیادت پر مودودی صاحب کا یہ الزام صحیح ہوتا تو قائدِ اعظم اس اجلاس کا بائیکاٹ کیوں کرتے جو لارڈ ویول نے کمانڈر انچیف کی حیثیت سے طلب کیا تھا؟ قائدِ اعظم وائسرائے کی بنائی ہوئی، وار کونسل میں مسلم لیگیوں کو شامل کیے کے احکام کیوں جاری کرتے؟ اور مسلم لیگ کے جو ممبر اس کے باوجود وار کونسل کے ممبر بن گئے انھیں اس پاداش میں مسلم لیگ سے کیوں نکالا جاتا؟

فصل ـــ ۵

مظلوم مسلمانوں سے اظہارِ برّیت

تحریکِ پاکستان منزلِ مقصود پر پہنچنے والی تھی کہ مظلوم اور نہتے مسلمانوں پر ہندوؤں نے منظم حملے شروع کر دیئے۔ یہ ایک ایسا موڑ تھا کہ آزادی کے لیے ہندو کے دوش بدوش چلنے والے کارکن بھی خون کے آنسو رو اُٹھے۔ غیرت و حمیت کے تقاضوں پر انھوں نے لبیک ی اور مظلوم مسلمانوں کو بچانے کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ مگر مودودی صاحب ں موقعہ پر بھی مسلمانوں کا ساتھ دینے کے لیے تیار نہ تھے۔ وہ اسے اللہ رسول کا نہیں، س کا کام قرار دے رہے تھے۔ ۱۷، ۱۸ اپریل ۱۹۴۷ء کو ٹونک کے مقام پر جماعتِ اسلامی اجتماع ہوا۔ اس موقع پر جماعتِ اسلامی کے ایک کارکن نے ہندوؤں کی سفاکی کا حوالہ یتے ہوئے مودودی صاحب سے اپیل کی کہ وہ اس سلسلے میں مسلمانوں کا ساتھ دیں۔ ں نے یہ بھی اپیل کی کہ اب جب کہ انگریز ملک سے رخصت ہوا چاہتا ہے جماعتِ اسلامی سلم لیگ کا ساتھ دینا چاہیے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو اندیشہ ہے کہ ہندو اکثریت ہمیشہ کے لیے لمانوں پر مسلط ہو جائے گی۔ مگر مودودی صاحب اس پر بھی ٹس سے مس نہ ہوئے۔ یہ

سے شدید تر ہوگا اور آپ کہیں بھی لکیر نہیں کھینچ سکیں گے کہ فلاں حد تک تو ہم ان قومی تحریکوں کا ساتھ دیں گے اور وہاں پہنچ کر ان کا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ یہ تو ہے سوال کا ایک رُخ۔ دُوسرا رُخ جو اس سے کہیں زیادہ قابلِ غور ہے وہ یہ ہے کہ جب آپ ایک تحریک کو خود غیر اسلامی مان رہے ہیں تو پھر کس مُنھ سے مُسلمان سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ اس کا ساتھ دیا جائے۔ جن مسائل اور مصائب کا اس قدر رونا رویا جا رہا ہے یہ مسائل اور مصائب سِرے سے پیدا ہی نہ ہوتے اگر مُسلمان اسلام کے فی الواقع سچّے نمائندے ہوتے۔ اور اگر مُسلمان اب بھی سچّے مُسلمان بن جائیں تو آج ہی سارے مسائل ختم ہو سکتے ہیں۔ یہ لوگ ہندوستان کے ایک ذرا سے کونے میں پاکستان بنانے کو اپنا انتہائی مقصد بنائے ہُوئے ہیں لیکن اگر فی الواقع خلوصِ قلب سے اسلام کی نمائندگی کے لیے کھڑے ہو جائیں تو سارا ہندوستان پاکستان بن سکتا ہے اور اس میں ایک لادینی جمہُوری حکومت یا عوامی پارلیمنٹری حکومت نہیں بلکہ خالص خدا کی حکومت قائم ہو سکتی ہے۔ اسلام کی لڑائی اور قومی لڑائی ایک ساتھ نہیں لڑی جا سکتی۔ اگر لوگ اسلام اور اسلامی طریق کار کو اپنی خواہشاتِ نفس کے خلاف پا کر ان کو ترک کر دینا چاہتے ہیں تو سیر پھیر کے راستوں سے آنے کے بجائے صاف صاف کیوں نہیں کہتے کہ اللہ اور رسُولؐ کے کام کو چھوڑ دیجئے اور ہمارے نفس کے کام میں حصّہ لیجیے۔"

(بحوالہ ص ۶۴، ۶۵ روئداد جماعتِ اسلامی حصّہ پنجم)

شائع کردہ مکتبہ جماعتِ اسلامی ذیلدار پارک اچھرہ لاہور)

اپریل ۱۹۴۷ء ہی میں مدراس میں بھی جماعتِ اسلامی کا اجتماع منعقد ہُوا

طرف خود اپنی ہی طرف سے تقسیم ملک کا یہ اصول پیش کیا کہ جہاں ہم اکثریت میں ہیں وہاں ہم حاکم اور تم محکوم، اور جہاں تم اکثریت میں ہو وہاں تم حاکم اور ہم محکوم۔ کئی سال کی تلخ اور خون ریز کشمکش کے بعد اب یہ مرکب حماقت "کامیابی" کے مرحلے میں پہنچ گئی ہے۔"

——— (روئیداد جماعتِ اسلامی حصّہ پنجم ص۱۱۴ ۱۱۵)

اس زمانے میں ہندوؤں کی طرف سے مسلمانوں پر جو مظالم ڈھائے جا رہے تھے مودودی صاحب اور ان کی جماعت نے اس کا ذمّہ دار بھی مسلم لیگ کو ٹھہرایا، ہندو پر کوئی تنقید نہ کی۔ ٹونک کے اجتماع میں قیم جماعتِ اسلامی میاں طفیل محمد صاحب نے جماعت کے کام کی جو رپورٹ پیش کی اس میں بتایا کہ:

"——— ان گئے گزرے حالات میں بھی جب کبھی ہمیں غیر مسلموں تک اللہ کا پیغام اس کے رسولؐ کے بتائے ہوئے طریقے پر پہنچانے کا موقع ملا تو ہم نے دیکھا کہ ان کی آنکھیں حیرت و استعجاب سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور منہ کھلے کے کھلے رہ گئے اور مسلمان قوم کے سخت سے سخت دشمن غیر مسلمین نے بے قرار ہو کر کہا کہ صاحب اگر ہمیں یقین ہو جائے کہ فی الواقع اسلام یہی ہے اور آپ لوگ واقعی اس کے پابند رہیں گے تو ہم دل و جان سے آپ کے ساتھ ہیں اور آپ کے پیچھے چلنے میں سعادت سمجھیں گے لیکن بُرا ہو قوم پرستی کا اور غیر اسلامی تحریکوں کے مسلمان علمبرداروں کا کہ انھوں نے خدا کے بندوں کے لیے دین کا دروازہ بند کر دیا۔"

——— (روئداد جماعتِ اسلامی حصّہ پنجم ص۲۷)

میاں صاحب نے اسی رپورٹ میں اپنے کارکنوں کو یہ مژدہ بھی سنایا کہ:

"——— آپ یہ سن کر خوش ہوں گے کہ ان ملک گیر فسادات میں جہاں

کا مطالبہ نہیں کریں گے۔ مولانا صاحب کے اپنے الفاظ ہیں:

"اب ہمیں وسیع پیمانے میں مسلمانوں میں ایسی رائے عامہ تیار کرنی چاہیے کہ وہ بحیثیت ایک قوم کے حکومت اور اس کے نظام سے بے رُخی اختیار کر لیں اور ہندو قوم پرستی کو اپنے طرزِ عمل سے یہ اطمینان دلا دیں کہ میدان میں کوئی دُوسری سیاسی قومیت اس کے ساتھ کشمکش کرنے کے لیے موجُود نہیں ہے۔ یہی ایک طریقہ ہے اس غیر معمولی تعصّب کو ختم کر دینے کا جو اس وقت غیر مُسلم اکثریت کے اندر اسلام کے خلاف پیدا ہو گیا ہے اور اسی طریقہ سے غیر مُسلموں کے اس اندیشے کو بھی دُور کیا جا سکتا ہے کہ اگر اسلام کو مزید اشاعت کا موقع دیا گیا تو کہیں پھر کسی علاقہ کے مسلمان ایک اور پاکستان مانگنے کے لیے کھڑے نہ ہو جائیں۔"

(روداد حصّہ پنجم ص ۱۲۹)

ذمہ دار راہنماؤں نے بھی شرارت پھیلانے والے لوگوں کی علانیہ تائید کی۔

واقعہ کی مختصر تفصیل یہ ہے کہ:۔

"اجتماع کے پہلے اجلاس میں جماعت کی سالانہ روداد سنائی جارہی تھی کہ مہ بجے شام کے قریب چالیس پچاس آدمیوں پر مشتمل ایک گروہ مسلم لیگ کا جھنڈا لیے ہوئے نعرے بلند کرتا ہوا اجتماع گاہ کے صدر دروازے پر آکر رکا اور اس نے نعروں اور دوسرے طریقوں سے اس قدر شور مچانا شروع کیا کہ باوجود لاؤڈ سپیکر کے مقرر کی آواز سامعین تک پہنچنی مشکل ہو گئی۔ امیر جماعت نے جو اس وقت اجلاس کے صدر تھے۔ قیم صاحب کو رپورٹ بند کر دینے اور شرکاء اجتماع کو بالکل خاموش اور پرامن رہنے کے لئے کہا اور اجتماع گاہ میں کامل خاموشی چھا گئی۔ باہر سے آنے والا گروہ بدستور شور کرتا رہا۔ کچھ آدمی اجتماع گاہ کے صدر دروازے پر چڑھ گئے اور انہوں نے دروازے پر مسلم لیگ کا جھنڈا لگا دیا۔"

دوسرے اجلاس میں مولوی مظہر الدین صاحب اور قیم جماعت نے تقاریر کیں حاضرین کی تعداد پانچ چھ سو تھی (اللہ اکبر! حاضرین کا یہ ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر۔ ک۔ن) جب قیم جماعت کی تقریر ختم ہوئی تو مسلم لیگ کے ایک سرکردہ کارکن ڈاکٹر نعمت اللہ صاحب نے حسب ذیل سوال چٹ پر لکھ کر قیم جماعت کو دیا:۔

"کیا اسلام اور مسلمان کی خدمت ایک وقت میں نہیں کی جاسکتی۔ اگر نہیں تو کیوں؟"

اس کے ساتھ ہی ایک مسلم لیگی عالم دین نے جو بہت بزرگ صورت اور عمر رسیدہ تھے حسب ذیل سوال لکھ کر قیم جماعت کو جواب کے لیے دیا۔

"اگر کسی فاسق و فاجر شخص کو اپنا راہنما بنالیں تو کیا ہم جہنم میں جائیں گے؟"

"قیم جماعت نے اس واقعہ کی پوری رپورٹ امیر جماعت کو دی اور انھوں نے فرمایا کہ چونکہ ہم لوگوں کی خدمت اور اصلاح کے لیے آئے ہیں۔ ان کو فساد میں مبتلا کرنے نہیں آئے۔ اس لیے اجتماع گاہ کو چھوڑ دیا جائے اور کل کی ساری کارروائی میری قیام گاہ (کوٹھی مولوی نذیر حسین صاحب قصوری) پر ہو۔ نیز کل خطابِ عام کا جلسہ بھی موقوف کر دیا جائے۔"

اجتماع گاہ تبدیل ہو گئی اور جلسۂ عام ملتوی ہو گیا۔ تو میاں صاحب کا کہنا ہے کہ دوسرے روز بہت سے لوگ امیر جماعت کو ملنے کے لیے آئے لیکن۔

"ان سب باتوں کے باوجود ہم سخت افسوس اور رنج کے ساتھ اس امر کا اظہار کرنے پر مجبور ہیں کہ بجز سیٹھ سر محمد جمال صاحب کے بہت کم لوگ ایسے تھے جن کو اس صورتِ حال پر فی الواقع افسوس ہوا ہو۔ ان میں سے اکثر تو اس بات پر فخر کر رہے تھے کہ مدراس کے مسلمانوں میں مسلم لیگ سے اس قدر گہرا تعلق پیدا کر دیا گیا ہے کہ اب وہ مسلمانوں میں کسی دوسری جماعت کے وجود کو گوارا ہی نہیں کر سکتے۔ خواہ اس کی دعوۃ کیسی ہی حق اور صحیح ہو۔"

میاں صاحب کا کہنا ہے کہ اگلے دن مغرب سے چند منٹ قبل مسلم لیگ کے چھ سات لیڈر آئے اور وہ ابھی مجھ سے بات چیت کر ہی رہے تھے کہ:۔

"اجتماع گاہ میں ایک ہنگامہ شروع ہو گیا اور اس قدر شور مچا کہ امیر جماعت کی قیام گاہ میں بھی جہاں آج کے اجتماع کی کارروائی ہو رہی تھی کام کرنا مشکل ہو گیا۔"

بلوائیوں نے پورے اجتماع گاہ میں مسٹر[1] جناح کی بیسیوں تصویریں

---

[1] واضح رہے کہ جماعت اسلامی کا امیر اور اس کے کارکن اس زمانے میں قائداعظم کو مسٹر جناح ہی کہا کرتے تھے حضرت قائداعظم رحمۃ اللہ علیہ کہنا تو ان حضرات نے اپنی مصلحتوں کے تحت ابھی حال ہی میں سیکھا ہے۔

فصل — ۷

قومی دشمن سے راہ و رسم

اِدھر مسلم لیگ اور جماعتِ اسلامی کے درمیان تعلقات کی نوعیت یہ تھی اور اُدھر کانگرس ۱۹۳۸ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک مودودی صاحب کے کام کی اتنی بڑی قدردان تھی کہ جب اپریل ۱۹۴۷ء میں پٹنہ کے مقام پر جماعت اسلامی کا اجتماع منعقد ہوا تو گاندھی جی جماعت کی دعوت پر بہ نفسِ نفیس اس اجتماع میں شریک ہوئے۔ یہاں تک کہ اس مقصد کے لیے انھوں نے اپنی پرارتھنا کی تقریر بھی ملتوی کر دی۔ جماعت اسلامی کے جلسۂ عام میں ان کی تشریف آوری کی تمام تفصیلات بھی روئداد جماعت اسلامی حصّہ پنجم کے صفحہ نمبر ۱۷ تا ۱۷ کی زینت ہیں گاندھی جی کے ہمراہ دو خواتین بھی تھیں۔ وہ کوئی پون گھنٹے تک سٹیج کے قریب بیٹھے جلسہ کی کارروائی سنتے رہے۔ اور جب مقرر سٹیج سے اتر کر گاندھی جی کے پاس آیا تو گاندھی جی نے جماعت کی اپنی رپورٹ کے مطابق ان لفظوں میں مقرر کو داد دی کہ:۔

"میں نے آپ کی تقریر کو بڑے غور سے سُنا اور مجھے اسے سن کر بہت مسرّت ہوئی۔"

سے بچنا چاہتے تھے۔ کرایہ تو خیران کے ہاتھ پر فوراً رکھ دیا۔ مگر یہ اندازہ ہو گیا کہ جب قوم پرستی لوگوں کا دین بن جاتی ہے تو کیسی کیسی ذلیل بداخلاقیاں ان کے لیے عین اخلاق بن جاتی ہیں۔"

مسلم لیگی پریس میں بھی اس واقعہ پر شدید ردعمل ظاہر ہوا۔ چنانچہ نوائے وقت نے اپنی ۳۰ اپریل ۱۹۴۷ء کی اشاعت میں "مولانا مودودی کی خدمت میں برکت میں" کے زیر عنوان ایک طویل شذرہ سپرد قلم کیا جس کے چند اقتباسات حسب ذیل ہیں۔ نوائے وقت نے لکھا:۔

"مولانا مودودی جن خیالات کی مسلمانوں میں تبلیغ کر رہے ہیں، وہ ہمیں ایک مدت سے معلوم ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ ان کی رائے میں ہندوستان کے مسلمان صحیح معنوں میں مسلمان ہی نہیں ہیں۔ اس لیے ان کی کوئی تحریک اور کوئی جماعت مولانا کی ہمدردی کی مستحق نہیں، مولانا کا نقطۂ نظر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ از سرِ نو مسلمان بنیں تو مولانا کی امداد کے مستحق ٹھہریں گے ورنہ موجودہ صورت میں مولانا کو ان سے کوئی ہمدردی نہیں۔ نہ ان سے وہ کوئی سروکار رکھنا چاہتے ہیں۔ غالباً یہی تلقین مولانا اپنے مریدوں کو بھی فرماتے ہیں۔"

"یہ تو سُنا تھا کہ مولانا مودودی بھی اب میدانِ سیاست میں قائدانہ شان کے ساتھ اترنے والے ہیں۔ لیکن کیا یہ ضروری تھا کہ جماعت اسلامی کے پہلے پبلک جلسہ ہی میں مسٹر گاندھی کو بلا کر کہیں اور نہیں خاص بہار میں فساد اور فتنہ آرائی کی ساری ذمہ داری مسلمانوں کے سر تھوپ دی جائے کہ چونکہ وہ اسلام اور نیشنلزم کو خلط ملط کر رہے ہیں (یعنی پاکستان کی نیشنلسٹ تحریک کو اسلامی تحریک سمجھتے ہیں) اس لیے ان کی اس کج خیالی کا نتیجہ نواکھالی بہار اور پنجاب کے افسوسناک واقعات کی صورت میں ظاہر ہوا۔"

قائم ہو جاتا۔ مسلم لیگ ان انتخابات میں یہ ثابت کرنے کے لیے حصّہ لے رہی تھی کہ مسلمان ہندوؤں کے مقابلہ میں ایک جداگانہ قوم ہیں اور اپنے لیے ایک علیحدہ مملکت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ مگر مسلمانانِ ہند کی تاریخ کے اس نازک موڑ پر بھی مودودی صاحب نے مسلم لیگ کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ ان کے اپنے عقیدت مندوں نے ان سے اپیل کی کہ وہ کم سے کم اس اہم مرحلے پر تو انھیں مسلم لیگ کے حق میں ووٹ دینے کی اجازت دے دیں۔ مگر مودودی صاحب کا فتویٰ یہ تھا کہ اس الیکشن میں حصّہ لینا اسلام کے خلاف ہے۔ اس لیے ہمیں اس کی کچھ پرواہ نہیں کہ ان انتخابات کے نتیجہ میں ہندو ملک پر مسلّط ہو جائیں گے یا دس کروڑ مسلمانوں کی قومی ہستی ختم ہو جائے گی۔ چنانچہ ایک سوال کے جواب میں انھوں نے عنیر مبہم انداز میں یہ اعلان کیا کہ:۔

"ووٹ اور الیکشن کے معاملے میں ہماری پوزیشن کو صاف صاف ذہن نشین کر لیجیے۔ پیش آمدہ انتخابات یا آئندہ آنے والے اسی طرح کے انتخابات کی اہمیّت جو کچھ بھی ہو اور ان کا جلیسا کچھ بھی اثر ہماری قوم یا ہمارے ملک پر پڑتا ہو۔ بہر حال ایک با اصول جماعت ہونے کی حیثیت سے ہمارے لیے یہ ناممکن ہے کہ کسی وقتی مصلحت کی بناء پر ہم ان اصولوں کی قربانی گوارا کر لیں جن پر ہم ایمان لاتے ہیں۔" (ترجمان القرآن ستمبر اکتوبر ۱۹۴۵ء بحوالہ رسائل و مسائل جلد اوّل صفحہ ۵۱۳)

خدا کا شکر ہے کہ مودودی صاحب کی اس متکبرانہ اور سنگدلانہ روش کے باوجود مسلمانانِ ہند نے ان انتخابات میں متفقہ طور پر پاکستان کے حق میں ووٹ دیئے اور اس طرح وہ منزل قریب تر آ گئی۔ جس کے لیے گنہگار مسلمانوں نے بڑی عظیم قربانیاں پیش کی تھیں۔ بقول شاعر

مجھے ہے جان سے پیاری وہ صبح جس کے لیے
بہا ہے میرے ستاروں کی انجمن کا لہو!

مگر ابھی ایک مرحلہ اور باقی تھا۔ وہ مرحلہ یہ تھا کہ صوبہ سرحد پاکستان میں شامل ہو یا

بابِ سوئم

قیامِ پاکستان کے بعد جماعتِ اسلامی کا کردار

- مہاجروں کو بزدل اور بھگوڑے کا طعن ——— ۹۵
- قائدِ اعظم کے حضور گستاخی ——— ۹۷
- مسلم لیگی قیادت پر حملے ——— ۱۰۴
- قراردادِ مقاصد پر اظہارِ خیال ——— ۱۱۰
- ایک اور شوشہ ——— ۱۱۴

فصل — ۱

مہاجروں کو بزدل اور بھگوڑے کا طعن

مودودی صاحب کی طرف سے مسلمانوں کے تازہ تازہ زخموں پر نمک چھڑکنے کا آغاز مہاجرین کی توہین سے ہوا۔ وہ اہلِ ایمان جو اپنے گھر بار چھوڑ کر بال بچوں کو کٹا کر عصمتیں لٹوا کر پاکستان کی طرف ہجرت کر آئے تھے۔ مودودی صاحب نے انھیں "بھگوڑا اور بزدل" کہنا شروع کر دیا بعد میں تو وہ مشرقی پاکستان میں "مقامی اور مہاجر" کا تفرقہ ڈال کر فسادات کے لیے راہ ہموار کرنے سے بھی نہیں چوکے۔ مگر ایک زمانہ تھا جب وہ ان غریب مسلمانوں کو "مہاجر" کہنا بھی شرعاً ناجائز سمجھتے تھے اور یہ ہم اپنی طرف سے نہیں کہتے۔ اس دور کے اخبارات کی فائلیں اس کی گواہ ہیں۔

۱۹۴۸ء میں مودودی صاحب۔ میاں طفیل صاحب کی معیت میں جھنگ کے دورے پر آئے تو مشہور صحافی اور روزنامہ "نوائے وقت" کے وقائع نگار خصوصی عرفان چغتائی مرحوم اپنے بعض دوستوں کے ہمراہ ان سے ملنے کے لیے تشریف لے گئے۔ عرفان مرحوم نے اپنی اس ملاقات کا حال روزنامہ نوائے وقت ۲۹ راگست ۱۹۴۸ء میں قلم بند کیا ہے۔ وہ

فصل ___ ۲

قائدِ اعظمؒ کے حضور گستاخی

یہ تو قیامِ پاکستان کے فوراً بعد مودودی صاحب کی مجلسی گفتگوؤں کی ایک ہلکی سی جھلک تھی۔ اصل میں تو آپ تحریر کے دھنی تھے، چنانچہ حسبِ معمول اس میدان میں بھی آپ نے اپنا پرانا کاروبار برابر جاری رکھا۔ نہ تحریکِ پاکستان کو معاف کیا نہ اس کی قیادت کو۔

جون ۱۹۴۸ء کے ترجمان القرآن میں قائدِ اعظم کی وفات سے صرف دو ڈھائی ماہ پہلے مودودی صاحب نے قائدِ اعظم کو جو خراجِ عقیدت پیش کیا وہ یہ تھا۔

"دس سال سے مسلمانوں کی قیادتِ عظمیٰ جس لائحہ عمل پر چل رہی تھی وہ سلطان عبدالحمید خان کی سیاست سے ملتا جلتا[1] تھا۔ جس طرح وہ ۳۳ سال تک محض ول

---

[1] جو لوگ تاریخ پر نظر رکھتے ہیں وہ باآسانی فیصلہ کر سکتے ہیں کہ مودودی صاحب نے سلطان عبدالحمید خاں جیسے وسیع و عریض مملکت کے فرماں روا سے قائدِ اعظم جیسے بے سروسامان مجاہد کا موازنہ کر کے کتنا ظلم کیا ہے۔ کہاں مصر شام عراق حجاز بلقان اور یورپ و ایشیا کے کئی علاقوں کا بادشاہ اور کہاں ایک غلام ملک کا باشندہ۔ سلطان عبدالحمید نے ان وسائل کے باوجود کچھ نہ کیا تو یہ واقعی اس کی ناکامی تھی مگر قائدِ اعظم نے "تو مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی" کے مصداق ہندو اور انگریز دونوں کی سازش کو ناکام بنا دیا۔ اس پر بھی مودودی صاحب یہ ریمارکس دیں تو اس کا کیا علاج؟

مقام کا تعین فرمائیں کہ آپ اس کے "ولن" تھے یا "ایجیٹیٹر" مگر ظاہر ہے۔ اس طرح کی شرعی گالیاں دینے کا حق ہم ایسے گنہگاروں کو کیسے پہنچ سکتا ہے! اس کے جملہ حقوق تو صرف صالحین نے نے محفوظ کرا رکھے ہیں۔

جولائی ۱۹۴۸ء کے ترجمان القرآن میں مودودی صاحب نے اپنے اس پسندیدہ موضوع پر پھر قلم اٹھایا اور اب کے بھی ان کا "نالہ" وہیں تھا۔ مولانا نے لکھا:۔

"یہ تحریک (تحریک پاکستان) ایک قومی تحریک تھی۔ اس میں وہ سب لوگ شریک ہوئے جو نام و نسب کے اعتبار سے مسلم قوم کے افراد تھے۔ یہ سوال اس میں سرے سے بے محل تھا کہ جو اس میں شریک ہوتا ہے۔ وہ خدا اور رسولؐ آخرت، وحی، کتاب اور دین و شریعت کو مانتا ہے یا نہیں اور فجور و تقویٰ دین داری اور بے دینی کی مختلف صفات میں کس صفت کے ساتھ متصف ہے، اصل مسئلہ قوم کو بچانے کا تھا اور اس کے لئے قوم کے تمام عناصر کا متحدہ محاذ بننا ضروری تھا۔ پھر جو کام پیش نظر تھا۔ وہ بھی فتویٰ اور امامت کا نہ تھا کہ دین و اعتقاد اور حرام و حلال کی تمیز کا قائل ہونے کے تجسس کی ضرورت پیش آئی۔"

اور آخر میں تان اسی پرانے غم اور غصے پر آکر ٹوٹی کہ ہمارے ہوتے قائدِ اعظم کو کیوں لیڈر بنا لیا گیا۔ فرمایا:۔

"مقصود صرف قومی مدافعت تھی اور اس کے لئے تحریک کی شرکت تو درکنار اس کی قیادت اور راہنمائی کے معاملے میں بھی یہ دیکھنے کی حاجت نہ تھی کہ جن لوگوں کو ہم آگے لا رہے ہیں، ان کا اسلام سے کیسا اور کتنا تعلق ہے"؟ (صفحہ ۱۳۱)

اخلاق کی سرے سے کوئی پوچھ نہ تھی" (صہ ۱۴۲)

مودودی صاحب کو مسلم لیگ سے صرف یہی گلہ نہ تھا کہ اس میں منافق اور ملحد لوگ شامل ہیں یا اس کی قیادت مذہب و اخلاق سے عاری تھی وہ اس کی مخالفت میں اتنے آگے نکل چکے تھے کہ پاکستان بننے کے بعد بھی انھوں نے پاکستان کی بنیادی اسکیم کو طنز و تعریض کا نشانہ بنانے سے گریز نہیں کیا۔ ترجمان القرآن کی اسی اشاعت میں آپ نے مزے لے لے کر لکھا:۔

"یہ تو تھا ہماری اس عظیم الشان قومی تحریک کا اخلاقی و دینی پس منظر اب ذرا اس کے اصل کام کا جائزہ لیجئے جو وہ قوم کو بچانے کے لیئے کر رہی تھی۔ مسلمانوں کا قومی مطالبہ جو اس نے مرتب کیا یہ تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی عددی اکثریت کے لحاظ سے ملک تقسیم کر دیا جائے اس مطالبہ کے اندر آپ سے آپ تین باتیں شامل تھیں۔ ایک یہ کہ تقریباً آدھے مسلمان ہندوؤں کے غلام بن کر رہ جائیں گے۔ دوسرے یہ کہ مسلمانوں کی قومی ریاست دو ایسے چھوٹے خطوں میں بنے جن کی حیثیت ہندو ریاستوں کی سرحد پر قریب قریب وہی ہو جو پولینڈ اور چیکوسلواکیہ جیسی ریاستوں کی حیثیت روس کی سرحدوں پر ہے۔ تیسرے یہ کہ ان دو خطوں کے درمیان بھی ایک ہزار میل کا ہندو علاقہ حائل ہو اور ان کے درمیان نہ حالتِ امن میں پوری طرح تعاون ہو سکے نہ حالتِ جنگ میں ایک دوسرے کی مدد حاصل کر سکیں [1]" (صفحہ ۱۴۳)

---

[1] مودودی صاحب نے تو اس عبارت میں پھر کچھ احتیاط کر لی۔ وگرنہ ان کے رفیقِ کار اور برصغیر پاک و ہند کے مایۂ ناز صحافی حضرت مولانا نصر اللہ خاں عزیز تو لگی لپٹی بغیر اس پاکستان کو "فاقستان" اور "لنگڑا پاکستان" کہہ کر یاد فرما چکے تھے اور قائدِ اعظم کو آپ نے ہٹلر اور مسولینی سے تشبیہہ دی تھی۔

(ملاحظہ ہو کوثر ۱۷ جون ۴۷ء اور ۱۳ جون ۴۷ء اور ۱۳ جنوری ۴۷ء)

مودودی صاحب کی ان نگارشاتِ عالیہ پر غور کیا جائے تو ہر شخص بلا تامل اس نتیجے پر پہنچے گا کہ انہوں نے قیامِ پاکستان سے پہلے اور بعد غریب مسلمان قوم کا یہ جرم کبھی معاف نہیں کیا کہ اس نے ان کے سوا ایک اور شخص کو اپنا قائدِ اعظم کیوں بنا لیا۔ اس جرم کی پاداش میں انہوں نے قوم کی بھی توہین کی اور قائدِ اعظمؒ کی بھی۔

پاکستان کی جنگ لڑی جا رہی تھی تو انھیں یہ دکھ لاحق تھا کہ انھوں نے آزادی کے جو تین خاکے پیش کیئے (یا اُڑائے) تھے۔ انھیں پسِ پشت ڈال کر اقبال اور جناح کی تجویز کیوں تسلیم کر لی گئی ہے۔ ان ایسے عالم فاضل کے ہوتے اسلام سے ایک بالکل ناواقف آدمی کو قیادتِ عظمیٰ کا منصب کیوں پیش کر دیا گیا ہے اور جب پاکستان بن گیا تو اپنی تمام تر مخالفتوں کے باوجود انھوں نے ایک مرتبہ پھر یہ کہہ کر قیادتِ عظمیٰ کی ذمہ داریوں کے لیئے اپنے "دوشِ ناتواں" آگے کر دیئے کہ:[1]

شاید مجھے نکال کے پچھتا رہے ہوں آپ
محفل میں اس خیال سے پھر آ گیا ہوں میں

---

[1] اس سے پہلے جون ۴۸ء کے ترجمان القرآن میں قیامِ پاکستان کی جدوجہد پر تبصرہ کرتے ہوئے حضرت مولانا نے فرمایا تھا "یہ بحث ان سب لوگوں کا منہ کالا کر دینے والی ہے جنھوں نے پچھلی رُبع صدی میں ہماری سیاسی تحریکوں کی قیادت فرمائی ہے۔" ص۴

شان میں وہ گستاخیاں کی گئیں کہ شرافت سر پیٹ کر رہ گئی۔

یہاں زیادہ تفصیلات میں جانے کا موقعہ نہیں صرف ترجمان القرآن کے جون، جولائی ۱۹۴۹ء کے شذرہ شمارے کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمایئے۔ جس میں قائدِ اعظم کے عہدِ حکومت سے لے کر قائدِ ملت خواجہ ناظم الدین مرحوم تک کے زمانۂ اقتدار تک پر کیچڑ اچھالا گیا ہے اور انھیں خیانت کار اور "اخلاق باختہ قائد" تک کہنے میں تامل نہیں کیا گیا۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

"پھر یہ عین وہی لوگ ہیں جو اپنی پوری سیاسی تحریک میں اپنی غلط سے غلط سرگرمیوں میں اسلام کو ساتھ ساتھ گھسیٹتے پھرے ہیں۔ انھوں نے قرآن کی آیتوں اور حدیث کی روایتوں کو اپنی قوم پرستانہ کشمکش کے ہر مرحلے میں استعمال کیا ہے۔ انھوں نے پاکستان کے معنی ہمیشہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ بیان کئے ہیں لیکن افسوس کہ ان کی محبتِ اسلام کے، ان کی خدا پرستی کے، ان کی حُبِّ رسالت کے۔ ان کی قرآن دوستی کے اور ان کی لَا اِلٰہ خوانی کے جو عملی مناظر پاکستان کی ۲۳ ماہ کی تاریخ کے عجائب خانے میں آراستہ ہیں ان کو دیکھ کر ہر مسلمان کی گردن شرم سے جھکی جاتی ہے۔

کسی ملک اور قوم کی انتہائی بدقسمتی یہی ہو سکتی ہے کہ نااہل اور اخلاق باختہ قیادت اس کے اقتدار پر قابض ہو جائے۔ ایک سفینۂ حیات کو غرق کرنے کے لئے طوفان کی موجیں وہ کام نہیں کر سکتیں جو اس کے خیانت کار ملاح کر سکتے ہیں۔ کسی قلعہ کی دیواروں کو دشمن کے گولے آسانی سے نہیں چھید سکتے جس آسانی سے اس کے فرض ناشناس سنتری اس کی تباہی کا سامان کر سکتے ہیں۔"

اتنا کچھ لکھنے اور الزامات اور اتہامات کا سارا ترکش خالی کرنے کے بعد اب حرفِ مطلب بھی سُن لیجیئے۔ ترجمان القرآن کے مرتب فرماتے ہیں۔

ملاحظہ ہو۔ ترجمان القرآن جون ۴۸ء) اس پر حکومت نے جماعت کے بعض کارکنوں کے خلاف محکمانہ کارروائی بھی کی چنانچہ روزنامہ نوائے وقت (۲ ستمبر ۴۸ء) میں یہ خبر شائع ہوئی کہ:۔

"سول سیکرٹریٹ کے ایک اسسٹنٹ کو اس بنا پر معطل کر دیا گیا ہے کہ اس نے حکومت پاکستان سے وفاداری کا حلف اٹھانے سے انکار کر دیا اور کہا کہ میں اس صورت میں پاکستان کا وفادار رہ سکتا ہوں جس صورت میں اس کا نظامِ حکومت شرعی ہو۔"

یہی نہیں جماعتِ اسلامی نے دفاعِ پاکستان میں بھی رخنے پیدا کیے اور پاکستانی فوج تک کے بارے میں یہ موقف اختیار کیا کہ اس میں بھرتی ہونا حرام ہے۔ نوائے وقت ۳۱ اکتوبر ۴۸ء میں میاں طفیل محمد صاحب نے جماعت کی مجلسِ شوریٰ کے اس فیصلے کا اعلان کیا کہ:۔

"موجودہ حکومت پاکستان غیر اسلامی ہے۔ اس لیے ہم مسلمانوں کو اس کی فوج یا ریزرو دستوں میں بھرتی ہونے کا مشورہ نہیں دے سکتے۔"

ظاہر ہے کہ پاکستان میں یہ اعلان بآسانی برداشت نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس پر سخت لے دے شروع ہو گئی۔ تب جماعتِ اسلامی نے پینترا بدلا اور اس کے قائم مقام امیر صاحب نے یہ وضاحت فرمائی کہ ہماری یہ ہدایت تو صرف ارکان جماعت کے لیے ہے اور ارکانِ جماعت سے بھی ہم صرف اتنا چاہتے ہیں کہ وہ دفاع وغیرہ کی ٹریننگ تو لیں۔ لیکن پاکستانی فوج میں بھرتی نہ ہوں۔ امیر جماعت نے فرمایا:۔

"ارکانِ جماعت کے لیے ہماری ہدایت یہ ہے کہ وہ اپنی توجہات کو اصلاً اقامت دین کی جدوجہد پر مرتکز رکھتے ہوئے دفاع کے مختلف کاموں کی تربیت حاصل

لہ چونکہ اس حلف سے اس نظامِ حکومت سے وفاداری کی قسم کھانی پڑتی ہے۔ جو از روئے قانون قائم ہے۔ اس لیے یہ حلف اس وقت تک ناجائز ہے۔ جب تک یہ نظام حکومت پورے طور پر اسلامی نہ ہو جائے۔ (مودودی)

مودودی صاحب نے انھیں نہ روکا۔ نمائشی پراپیگنڈا دوسری چیز ہے لیکن کوئی شخص اس سے انکار نہیں کرسکتا کہ گورنمنٹ آف انڈیا کے بعض اعلیٰ افسر مودودی صاحب کے معاون و سرپرست اور مودودی صاحب کو ان سے مالی اعانت بھی ملتی رہی۔ حیرت ہے کہ جب تک انگریز راج تھا۔ اس وقت تک مودودی صاحب نے نہ تو یہ فتویٰ دیا کہ لڑائی کے لیے فوج میں بھرتی حرام ہے۔ نہ نہ اعلان کیا کہ میرے معاونوں اور مریدوں کو انگریزی حکومت سے بغاوت کا اعلان کر دینا چاہیئے لیکن پاکستان آکر انھوں نے اپنا معیار کچھ اس ڈھنگ کا بنایا کہ پاکستان کے انتہائی مشکلات کے دور میں بھی قدم قدم پر ان کا حکومت سے تعاون ناگزیر ہوگیا۔ حلف وفاداری کے مسئلے پر حکومت پنجاب سے ان کی چپقلش اسی بنا پر ہوئی اور فوجی بھرتی کا قضیہ بھی اسی وجہ سے پیش آیا"۔

اخبارات کی اس زبردست تنقید اور ملک گیر احتجاج سے جماعت اسلامی گھبرا گئی اور اپنے اس مضحکہ خیز موقف سے دستبردار ہونے کے بہانے ڈھونڈنے لگی۔

کرانا چاہتی تھی۔ اس لئے اس نے قرار دادِ مقاصد کو غنیمت جان کر جھٹ سے پاکستان کو اسلامی ریاست ماننے کا اعلان کر دیا۔

یہ قرار دادِ مقاصد کیا تھی۔ اس میں نہ تو پاکستان کے بارے میں یہ وضاحت کی گئی تھی کہ یہ اسلامی ریاست ہوگی اور نہ اس میں اسلام کو سرکاری مذہب ہی تسلیم کیا گیا تھا۔ ہائی کورٹ کے اس وقت کے فاضل چیف جسٹس مسٹر محمد منیر اور جسٹس مسٹر ایم آر کیانی نے اس قرار دادِ مقاصد پر جو جامع اور بلیغ تبصرہ کیا تھا۔ اس کے الفاظ یہ ہیں کہ:۔

"اگرچہ یہ قرار داد الفاظ و فقرات کے لحاظ سے بہت بلند بانگ معلوم ہوتی ہے۔ لیکن حقیقت میں محض دھوکا ہے اور اس میں نہ صرف مملکتِ اسلامی کا ہیولیٰ تک شامل نہیں۔ بلکہ اس کی دفعات خصوصاً جو بنیادی حقوق سے متعلق ہیں واضح طور پر مملکتِ اسلامی کے اصولوں کے منافی ہیں۔" (رپورٹ تحقیقاتی عدالت ص۲۱۷)

اور یہ تنہا جدید قانون کے ان ماہرین ہی کی رائے نہ تھی۔ ایک زمانہ تھا کہ خود مولانا ابوالاعلیٰ صاحب مودودی بھی اس سلسلے میں کم و بیش یہی رائے رکھتے تھے۔ چنانچہ خود موصوف ترجمان القرآن اکتوبر ۱۹۵۲ء میں لکھتے ہیں:۔

"آخر کار سارے ملک میں شور برپا ہو گیا۔ ہر طرف سے تقاضے شروع ہوئے تار بھیجے گئے، خطوط کی بھرمار ہوئی، جلسوں میں مطالبے گئے، تب کہیں قیام پاکستان کے انیس مہینے بعد قرار دادِ مقاصد کی اذان، دی گئی اور وہ بھی صاف الفاظ میں نہیں بلکہ ایسے پیچیدہ الفاظ میں جن سے بس منطقی استنباط ہی کے طور پر اسلامی حکومت کا مفہوم اخذ کیا جا سکتا ہے۔"

پر لطف بات یہ ہے کہ آج جماعت قرار دادِ مقاصد کی منظوری کا سہرا اپنے سر باندھتی ہے اور میاں طفیل محمد صاحب نے تو سالوں کے بعد پہلی مرتبہ یہ دعویٰ بھی فرمایا ہے کہ اس کا مسودہ قائدِ ملت نے مودودی صاحب کو ملتان جیل میں بغرضِ منظوری بھجوایا تھا مگر جب دستور یہ میں

اس زمانے میں بھی کہنے سے نہیں چوکے تھے جب کہ قائدِ اعظم کی وفات
کے بعد پاکستان چاروں طرف سے خطرات میں گھرا ہوا تھا۔"

کیا یہ توقع کی جائے کہ وہ آج بھی اپنی روایتی حق گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس
باب میں شریعت کا فیصلہ بتانے سے گریز نہیں کریں گے ؟

کے وارث ہو سکتے ہیں اور نہ اب پاکستان اور ہندوستان کے مسلمانوں کے درمیان شادی بیاہ ہی صحیح ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے ایک نئی الجھن کھڑی ہو سکتی ہے۔ کتنی ہی مسلمان بیویاں ایسی تھیں جن کے شوہر ہندوستان میں رہ گئے تھے اور کتنے ہی شوہر ایسے تھے جن کی بیویاں پاکستان میں نہ آسکی تھیں۔ پھر متروکہ جائیدادوں اور وراثتوں کے مسائل الگ تھے اور یہ تنہا ہندوستان کی بات نہ تھی۔ مودودی صاحب کے نزدیک تو دوسرے مسلمان ملک بھی جہاں شرعی نظام قائم نہیں۔ دارالاسلام کی تعریف سے خارج تھے۔ اس طرح ان مسلمان ملکوں کے عوام سے بھی شادی بیاہ کے تعلقات نادرست قرار پاتے تھے۔ اس پر ملک کے ممتاز عالم دین حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی نے اپنے ایک مفصل مکتوب کے ذریعے سے مودودی صاحب پر ان کے اس غلط اجتہاد کے نتائج و مضمرات واضح کرنے کی کوشش کی انھوں نے دلائل سے ثابت کیا کہ "یہ فتوے مذہب حنفی اور جملہ مذاہب اربعہ کے خلاف ہے۔

مولانا ظفر احمد نے لکھا:۔

> آج ہندوستان جیسا دارالکفر ہے ویسا ہی برطانیہ کی حکومت میں تھا۔ اور آج جیسا پاکستان دارالاسلام ہے ویسا ہی کسی وقت حیدرآباد بھی دارالاسلام تھا بلکہ کچھ زیادہ کہ وہاں محکمۂ امور مذہبی قائم تھا۔ جواب تک پاکستان میں قائم نہیں ہوا تو کیا آپ اس وقت ہندوستان اور حیدرآباد کے مسلمانوں میں باہمی شادی بیاہ اور توارث کو ممنوع سمجھتے تھے؟ یا اس وقت اگر کوئی حاجی مہاجر ہو کر مکہ مدینہ میں رہ جاتا اور اس کی موت کے وقت مکہ مدینہ میں اس کا کوئی وارث نہ ہوتا تو آپ یہ فتویٰ دے سکتے تھے کہ اس کے ہندوستانی رشتہ داروں کو اس کا ترکہ نہ دیا جائے۔"

مگر مودودی صاحب نے آج تک کبھی اپنی کوئی غلطی تسلیم کی ہے کہ وہ اس وقت مولانا ظفر احمد صاحب اور ملک کے دوسرے علمائے کرام کی تنبیہ پر اپنی اس افسوس ناک فروگزاشت کا اعتراف کرتے۔

باب چہارم

چند مغالطوں کی اصلاح

چند مغالطوں کی اصلاح

پچھلے صفحات میں تحریکِ پاکستان کے ساتھ مولانا مودودی اور ان کی جماعت کے تعلقات کی جو تفصیل بیان کی گئی ہے۔ اس پر نظر ڈالنے کے بعد ہر منصف مزاج انسان مودودی صاحب اور جماعت کے دوسرے لیڈروں کے ان بلند بانگ دعاوی پر افسوس کئے بغیر نہیں رہے گا۔ جو آج اخبارات کے صفحات سے لے کر منبر و محراب تک سے کیے جا رہے ہیں۔ مگر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بعض ان مغالطوں کی اصلیت بھی کھول دی جائے جنہیں مودودی صاحب اور ان کے عقیدت مند تحریکِ پاکستان میں اپنی خدمات کا سرعنوان بنا کر پیش کرتے ہیں۔

ایک دلچسپ مغالطہ یہ دیا جاتا ہے کہ مودودی صاحب اور قائدِ اعظم کے باہمی تعلقات نہایت گہرے اور دوستانہ تھے اور یہ انہی کا نتیجہ ہے کہ حضرت مولانا نے قیامِ پاکستان کے بعد ریڈیو پاکستان سے کئی مرتبہ اپنے خطبے نشر فرمائے اور میاں طفیل محمد صاحب کا کہنا ہے کہ ان کے امیرِ جماعت کی یہ تقریریں خود قائدِ اعظم مرحوم کے حکم سے نشر ہوئیں۔

قائدِ اعظم مرحوم سے مودودی صاحب کے دوستانہ تعلقات کا انکشاف پہلی مرتبہ

مودودی صاحب نے اب تک ریڈیو سے تین مختلف ادوار میں تقریریں نشر کی ہیں۔

۱۔ آل انڈیا ریڈیو سے انگریز کے زمانے میں

۲۔ پاکستان ریڈیو سے قائد اعظم کے عہدِ حکومت میں

۳۔ پاکستان ریڈیو سے صدر ایوب کے زمانے میں۔

گیارہ تقریریں مودودی صاحب نے آل انڈیا ریڈیو سے نشر فرمائیں۔ جو ترجمان القرآن اگست ۵۱ء میں شائع ہوئی ہیں اور سات تقریریں قائدِ اعظم کے عہدِ حکومت میں جن میں سے پانچ ان کی کتاب "اسلام کا نظامِ حیات" میں شامل ہیں، اور دو ترجمان القرآن کے اسی مذکورہ بالا شمارہ میں اس کے علاوہ تین یا چار تقریریں آپ نے صدر ایوب کے زمانہ میں نشر کی ہیں۔

اب اگر ریڈیو سے مذہبی تقاریر کا نشر ہونا۔ اس دور کے سربراہِ مملکت سے تعلقات کی دلیل ہے تو سب سے زیادہ مستحکم تعلقات تو موصوف کے انگریز بہادر سے ثابت ہوئے جس کے دور میں آپ نے سب سے زیادہ تقریریں نشر فرمائی تھیں اور کسی حد تک (کم سے کم قائدِ اعظم سے آدھے) تعلقات آپ کے صدر ایوب سے ثابت ہوتے ہیں۔ جن کے زمانے میں وہ تین چار مرتبہ ریڈیو پر تشریف لائے۔ ہم مودودی صاحب اور ان کے پرستاروں سے دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ وہ اپنی منطق کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے اس نقشۂ احوال کو قبول کرنے کے لیے تیار ہیں؟

اصل میں بات صرف اتنی ہے کہ پاکستان ریڈیو کی طرف سے پروگراموں کے لیے جو کنٹریکٹ فارم بھیجا جاتا ہے۔ خواہ وہ کسی مغنیہ کو بھیجا جائے یا کسی قوال یا کسی عالم کو اس پر یہ الفاظ چھپے ہوتے ہیں کہ "یہ معاہدہ ریڈیو کا ڈائرکٹر جنرل بہ ہدایت پریزیڈنٹ آف پاکستان کی طرف سے کر رہا ہے" جب قائدِ اعظم گورنر جنرل تھے تو اس زمانے میں ڈائرکٹر صاحب یہ معاہدہ گورنر جنرل آف پاکستان کی طرف سے کیا کرتے تھے۔ بس اتنی سی بات سے میاں طفیل محمد صاحب نے یہ سمجھ لیا کہ ہمارے مولانا سے تو یہ تقریریں براہِ راست قائدِ اعظم مرحوم

یہ کمیٹی کیا تھی؟ کس نے بنائی تھی؟ کب بنائی تھی؟ اور مودودی صاحب نے اس کے کام میں کس طرح پوری دلچسپی لی تھی۔ آیئے اس کی تفصیل مشہور مفسر قرآن حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی کی زبانی سنیئے۔

جنوری ۵۶ء میں دارالمصنفین اعظم گڑھ (بھارت) نے مولانا محمد اسحاق صاحب سندیلوی استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کی ایک کتاب "اسلام کا سیاسی نظام" شائع کی جس پر پیش لفظ مولانا دریابادی مدظلہٗ کے قلم سے ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں:۔

"یہ کتاب جو آپ کے پیش نظر ہے۔ اپنی تسوید و تالیف کی ایک مختصر سی مگر ذرا افسوسناک تاریخ بھی رکھتی ہے۔ سن غالباً ۴۰ء تھا یا اس سے بھی کچھ قبل جب مسلم لیگ کا طوطی ہندوستان میں بول رہا تھا کہ ارباب لیگ کو خیال یہ پیدا ہوا کہ جس اسلامی حکومت (پاکستان) کے قیام کا مطالبہ شد و مد سے کیا جا رہا ہے۔ خود اس کا نظام نامہ یا قانون اساسی بھی تو خالص اسلامی بنانا چاہیئے۔ اور اسی غرض سے یوپی کی صوبہ مسلم لیگ نے ایک چھوٹی سی مجلس ایسے ارکان کی مقرر کر دی جو اس کے خیال میں شریعت کے ماہرین تھے کہ یہ مجلس ایسا نظام نامہ مرتب کر کے لیگ کے سامنے پیش کرے۔

اس مجلس کے چھ ممبران میں ایک مولانا مودودی بھی تھے اور مولانا دریابادی لکھتے ہیں کہ مسلم لیگ کی فراخ مشربی اسی سے واضح ہے کہ اس مجلس کے بیشتر ممبر لیگ کے ممبر نہ تھے۔

پھر کیا ہوا مولانا فرماتے ہیں کہ مجلس کا تمہیدی اجلاس دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ہال میں ہوا اور مجلس کے داعی علامہ سید سلیمان ندوی قرار پائے اور طے پایا کہ مجوزہ کتاب کا ابتدائی مسودہ مولانا حکیم محمد اسحاق سندیلوی تیار کریں۔ جس کی ایک ایک نقل ہر ممبر کے پاس بھیجی جائے اور پھر یہ ممبران ایک بار جمع ہو کر اس مسودہ کو آخری شکل دے دیں۔

مولانا اسحاق نے یہ کتاب چند مہینوں میں مرتب کر لی۔ اس کی ایک ایک نقل بھی ہر

تو جائز ہے اور مجموعی طور پر عام مسلمانوں کو حق رائے دہی بھی حاصل ہے لیکن یہ حق ہر کہ دمہ کو حاصل نہیں ہے بلکہ اس کے لیے کچھ امتیازی صفات و شرائط کی احتیاج ہے۔ جو مسلمان ان شرائط کو پورا کرے گا۔ اسے حق رائے دہی حاصل ہوگا اور جو اس امتیاز سے محروم ہوگا۔ وہ حق رائے دہی سے بھی محروم ہوگا۔" ص ۲۰۵، ۲۰۶

"اور اس کے لیے اسلام شرط اولیں ہے۔ اسلام سے مراد وہی اسلام ہے جو صحابہ کرام کا تھا اور آج سوادِ اعظم کے نزدیک حقیقی اسلام وہی ہے۔ غیر مسلموں یا گمراہ فرقوں کو حق رائے دہی کے یہ معنی ہیں کہ مآل کار کے لحاظ سے انھیں اہلِ اسلام پر ایک قسم کا تسلط ہو جائے۔"

"عدل بھی ایک اہم اور ضروری شرط ہے۔ فاسق کی خبر شرعاً غیر معتبر ہے۔ اس کا یہ دُور رس سیاسی اقدام کیسے معتبر ہو سکتا ہے"

"عورتوں کے حق میں رائے دہی کا ثبوت دلائل شرعیہ میں سے کسی دلیل سے بھی نہیں ملتا۔ اس کے خلاف دلائل ذکر کرنے کی بھی ہمیں ضرورت نہیں"

(ان حوالوں کے لیے ملاحظہ ہو "اسلام کا سیاسی نظام ص ۲۰۶، ۲۰۷)

اس خاکہ میں غیر مبہم لفظوں میں بالغ رائے دہی کو غیر اسلامی قرار دیا گیا ہے۔ غیر مسلموں اور گمراہ فرقوں کو ووٹ کا حق نہیں دیا گیا۔ یہ حق صرف سوادِ اعظم کے لیے مخصوص ہے۔ صاف صاف کہا گیا ہے کہ ووٹ صرف صالح افراد دے سکیں گے۔ فاسق مسلمان نہیں، عورت کے تو ووٹ دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اگر مولانا مودودی صاحب اس خاکہ کی تیاری کا کریڈٹ لینا چاہتے ہیں تو شوق سے لیں۔ ہم اس میں آڑے آنے والے کون ہیں۔ لیکن ہاں ان سے اتنا ضرور پوچھنے کو جی چاہتا ہے کہ حضرت! جب ایک زمانہ میں آپ کا "اسلام" یہ کہتا تھا تو آج کس منہ سے آپ جمہوریت بالغ رائے دہی، مسلم اسلامی فرقوں کے حقوق کی حفاظت کے نعرے لگا رہے ہیں۔ کیا اسلام

رہی تھی۔ اس لیے بجز ایک قلیل گروہ کے جو اسلام کے اصولوں کو فی الواقع سمجھتا اور اس کا سچا قدر دان تھا۔ قوم کی قوم جماعت سے شاکی اور ناخوش تھی۔ اس لیے جماعت کے لیے یہ سخت مشکلات اور شدید آزمائش کا وقت تھا۔" صـ۱۲۶

آگے چل کر جماعت نے اس موقف میں یہ تبدیلی کرلی کہ وہ اس کا تو اعتراف کرنے لگی کہ تحریک پاکستان میں اس کا کوئی حصہ نہیں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہا جاتا رہا کہ ہم اس تحریک سے غیر متعلق رہے تھے۔ نہ اس کے حامی تھے نہ اس کے مخالف، ترجمان القرآن نومبر ۶۳ء میں لکھا گیا:۔

"ہم اس بات کا کھلے بندوں اعتراف کرتے ہیں کہ تقسیم ملک کی جنگ سے ہم غیر متعلق رہے ہیں۔ اس کارزگی کا سہرا ہم صرف مسلم لیگ کے سر باندھتے ہیں اور اس میدان میں کسی حصّے کا اپنے آپ کو دعویدار نہیں سمجھتے۔" (صـ۶۹)

اور اب آخری موقف یہ ہے کہ جماعت نے یک لخت تحریک پاکستان اور نظریۂ پاکستان کا سہرا اپنے سر باندھنا شروع کر دیا ہے میاں طفیل نے دعویٰ کیا ہے کہ اس باب میں جو خدمات مودودی صاحب نے انجام دی ہیں۔ وہ دوسرے تمام راہنماؤں کی خدمات پر بھاری ہیں۔ قائداعظم اور مودودی صاحب کے تعلقات کا چرچا کیا جا رہا ہے اور حیز سے خود مودودی صاحب نے بھی بہ نفسِ نفیس یہ چیلنج کر دیا ہے کہ کسی میں ہمت ہے تو ثابت کرے کہ میں نے کبھی بھی تحریکِ پاکستان کی مخالفت کی ہے۔

ہائی کورٹ کا فیصلہ

جماعت اور مودودی صاحب کی اس دیدہ دلیری اور سینہ زوری کو بے نقاب کرنے کے دو ہی راستے ہیں۔ ایک یہ کہ اس کے لیے باقاعدہ قانونی عدالت سے رجوع کیا جائے اور

کے تحت اس پروپیگنڈا کے ناقوسِ خصوصی بن چکے ہیں۔ اس کے سوا چارہ نہیں کہ یہ کیس خود عوام کی عدالت میں پیش کر دیا جائے تاکہ وہ آنے والے انتخابات کے ذریعے خود اس بات کا فیصلہ کر دیں کہ مودودی صاحب پاکستان کے دشمن ہیں یا دوست؟

مودودی صاحب میں اخلاقی جرأت ہوتی تو وہ پاکستان بننے کے بعد اپنی غلطیوں کا اعتراف کر کے قوم سے معافی حاصل کر سکتے تھے۔ اس فراخ دل قوم نے بہت سے لوگوں کو بخش دیا ہے تو مودودی صاحب کو کیوں نہ معاف کرتی۔ لیکن افسوس کہ سچائی کی راہ کو اختیار کرنے کے بجائے اس باب میں انھوں نے اپنے اس مشہور فتوے پر عمل کرنا شروع کر دیا کہ:۔

"راست بازی اور صداقت شعاری اسلام کے اہم ترین اصولوں میں سے ہے اور جھوٹ اس کی نگاہ میں بدترین برائی ہے۔ لیکن عملی زندگی کی بعض ضرورتیں ایسی ہیں۔ جن کی خاطر جھوٹ کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ بعض حالات میں اس کے وجوب تک کا فتویٰ دیا گیا ہے۔"

(ترجمان القرآن مئی ۵۸ء)

ہمیں آخر میں اپنے اہل وطن سے یہ عرض کرنا ہے کہ گزشتہ صفحات میں مودودی صاحب کا جو رول بیان کیا گیا ہے۔ وہ اس کا غور سے مطالعہ کریں جب تحریکِ پاکستان جاری تھی تو مودودی صاحب پاک و ہند کنفیڈریشن کا نظریہ لے کر مطلعِ سیاست پر نمودار ہوئے تھے۔ کانگریس اور مسلم لیگ کی کشمکش میں یہ تجویز برطانوی سامراج کی مرضی کے عین مطابق تھی آج جب کہ استحکامِ پاکستان کی جنگ لڑی جا رہی ہے۔ تحریکِ "آزادیٔ ہند اور مسلمان" نامی ایک کتاب کے ذریعے سے مودودی صاحب کی اس تجویز کو پھر پھیلایا جا رہا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ آج پھر ایک سامراجی طاقت اسی منصوبے کو عملی جامہ پہنانا چاہتی ہے۔ کل بھی مودودی صاحب ایک سامراج کی خدمت کر رہے تھے اور آج

باب پنجم

خلافت وملوکیّت

- گستاخانہ جسارت ۱۳۲
- مولانا مودودی اور خلافتِ راشدہ ۱۳۸
- حضرت عثمانؓ پر تنقید ۱۴۲
- خلافت و ملوکیت، ایک پراپیگنڈہ پمفلٹ ہے ۱۴۴

فصل ـــــ ۱

گستاخانہ جسارت

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور کی اشاعت مئی ۱۹۶۵ء میں مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی کے قلم سے خلافتِ راشدہ اور اس کی خصوصیات کے زیرِ عنوان ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس میں بعض تاریخوں کے حوالے سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ خلفائے راشدین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین میں سے حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت علیؓ کے مبارک زمانے حضرت عثمانؓ کے عہد سے زیادہ بے لاگ اور قبیلائی عصبیت سے زیادہ پاک تھے۔ حضرت عثمانؓ اس معاملے میں ان تینوں بزرگوں کے مقابلے میں معیارِ مطلوب کو قائم نہ رکھ سکے اور ان کے عہد میں بنی امیہ کو کثرت سے بڑے بڑے عہدے اور بیت المال سے وظیفے دیئے گئے اور دوسرے قبیلے اسے تلخی کے ساتھ محسوس کرنے لگے۔ ان (حضرت عثمانؓ) کے نزدیک یہ صلہ رحمی کا تقاضا تھا چنانچہ وہ کہتے تھے کہ:-

"عمر خدا کی خاطر اپنے اقربا کو محروم کرتے تھے اور میں خدا کی خاطر اپنے اقربا کو دیتا ہوں:

عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی سنت پر عمل کر کے اقربا کو محروم نہیں کرتے تو کوئی حرج نہیں وہ حضرت عثمانؓ کی سنت پر عمل کر کے خدا کی خاطر اقربا نوازی اور خویش پروری کرتے ہیں۔ ان کا فعل جائز اور عین اسلام ہے کیونکہ انھیں ایک ایسے صحابی رضی اللہ عنہ کی سند حاصل ہے جن کا انتخاب حضرت عمرؓ کی واضح تنبیہہ کے باوجود حضرت عمرؓ کی قائم کردہ مجلس شوریٰ نے کیا اور حضرت عمرؓ کی عائد کردہ اس شرط کی موجودگی میں یہ انتخاب عمل میں آیا کہ:۔

"منتخب خلیفہ سے عہد لیا جائے کہ وہ اپنے قبیلے کے ساتھ کوئی امتیازی برتاؤ نہ کرے گا"

اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ یہ حوالے اپنی جگہ درست ہیں پھر بھی سوال یہ ہے کہ کیا طبری اور ابن عبدالبر نے جو کچھ لکھا ہے وہی ہمارے لیے حرفِ آخر ہے اور مزید تحقیق ہم پر لازم نہیں آتی مولانا ممدوح کا وضع کردہ یہ اصول بہت مشہور ہے کہ "مزاج شناس رسولؐ" ہر اس حدیث کو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج کے مطابق اور موافق نہ ہو مسترد کر سکتا ہے خواہ یہ حدیث روایت اور اسناد کے تمام اصولوں پر صحیح اور درست اتر رہی ہو۔ اس اصول کے پیش نظر کیا یہ لازم نہیں آتا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ کے اصحاب کبار کے اعمال و اقوال کو اپنے کسی فیصلے کیلئے سند کے طور پر استعمال کرنے سے پہلے احتیاط کر لی جائے اور یہ سوچ لیا جائے کہ یہ بزرگ ہم میں سے ہر ایک سے کہیں زیادہ مزاج شناس رسولؐ تھے۔ انھیں اس بات کا علم تھا کہ امت رسول صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کے بعد ان کے اقوال و اعمال سے اسلام کو سمجھے گی اور دینِ سیاست میں ان سے بھی روشنی حاصل کرے گی ان کے اجتہاد آنے والی نسلوں کے اجتماعی اور انفرادی زندگی کے لئے سند ہوں گے اور انہیں سند ہونا چاہیئے کیونکہ یہی وہ براہِ راست واسطہ ہے جس کے ذریعے ہم اپنے مرکز حقیقی تک پہنچ سکتے ہیں

۱۹۶۵ء ہے اس کے متعلق بھارت اور پاکستان میں معروف روایات میں جو بُعد ہے اس سے نتائج کا استخراج کس انداز میں ہو رہا ہے۔ عوامی جمہوریہ چین اسی جنگ کے متعلق کیا نتیجہ اخذ کرتا ہے اور امریکہ اور انگلستان کی سیاسی مصلحتیں اسے کس نتیجے کی طرف لے جاتی ہیں۔ مسلمان ممالک ان روایات کی مدد سے کس بات کو 'تاریخ' کا نام دیتے ہیں اور ان کے مقابلے میں اسرائیل اسی جنگ کی 'تاریخ' کو کس عنوان کے تحت رکھ رہا ہے اور تو سب ایک طرف دو نہایت قریبی ہمسایہ ملک انڈونیشیا اور ملائیشیا ہیں۔ دونوں مسلمان ہیں۔ دونوں کے ساتھ پاکستان کے تعلقات خوشگوار ہیں لیکن خوشگوار تعلقات کی ڈگریوں میں فرق ہے۔ یہ فرق تنازعۂ کشمیر کی 'تاریخ' پر کس انداز میں اثر کر رہا ہے۔ ان تمام سوالات کے جواب سے اس 'تاریخ' کے مستند ہونے کا راز کھل جائے گا۔

مختصر یہ کہ تاریخی مآخذ کو استعمال کرنے والا جس انداز میں استعمال کرے گا وہ انداز اس کے ذہنی روئے پر دلالت کرتا ہے اگر رویہ ہمدردانہ ہے معاندانہ نہیں تو وہ انہی مآخذ سے تاریخی شخصیتوں کو ہیرو بنائے گا۔ اگر رویہ معاندانہ ہے ہمدردانہ نہیں تو انہی مآخذ کے حوالے سے سر ولیم میور 'لائف آف محمدؐ' لکھے گا یا ملائشیا کا ہندو مندوب اقوام متحدہ میں بیان دے گا۔

فصل ـــــ ۲

مولانا مودودی اور خلافتِ راشدہ

حضرت عثمانؓ غنی کے بارے میں ترجمان القرآن کے مئی کے شمارہ میں مولانا مودودی صاحب نے جو مضمون لکھا تھا اس پر ہماری معروضات "شہاب" کے ایک کھلے اداریہ میں قارئین ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ اداریہ میں اتنی گنجائش نہیں ہوتی کہ بحث کے جملہ پہلوؤں کا احاطہ کیا جا سکے۔ اس لیئے ہم نے اس میں چند اصولی باتوں پر اکتفا کیا تھا۔ اسے ہماری خوش فہمی کہہ لیجئے یا کچھ اور۔ ہم نے یہ سمجھا تھا کہ مولانا محترم ان گذارشات پر ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں گے اور اس سلسلہ کو مزید آگے نہیں بڑھائیں گے لیکن ترجمان القرآن کا تازہ ترین شمارہ دیکھ کر یہ توقع خاک میں مل گئی۔ اس میں مولانا موصوف نے بعض کتابوں کے حوالے دے کر حضرت عثمان غنیؓ کی اہلیت و صلاحیت سے لے کر ان کی دیانت و امانت تک کو چیلنج کیا ہے۔ مثلاً فرمایا ہے کہ حضرت عثمان نے :۔

"افریقیہ کے مالِ غنیمت کا پورا خمس (۵ لاکھ دینار) مروان کو بخش دیا۔" (ص ۳۴)

گویا عثمانؓ غنی نہ تھے اکبر بادشاہ تھے جو لاکھوں کی رقم مسلمانوں کے خزانے سے جس

رشتہ دار کو چاہتے تھے بخش دیتے تھے۔

مزید فرمایا ہے کہ خلافت کو ملوکیت بنا دینے کے تغیر کا آغاز حضرت عثمانؓ غنی کے زمانہ سے ہو گیا تھا۔

اس تغیر کا آغاز ٹھیک اس مقام سے ہوا جہاں سے اس جہاں سے اس کے رونما ہونے کا حضرت عمرؓ کو اندیشہ تھا۔ (صفحہ ۳۳-۳۴)

ان کے بعد حضرت عثمانؓ جب جانشین ہوئے تو وہ رفتہ رفتہ اس پالیسی سے ہٹتے چلے گئے۔ (صفحہ ۳۴)

ہم یہ نہیں کہتے کہ تاریخ کی بعض کتابوں میں اس طرح کی باتیں موجود نہیں یقیناً موجود ہیں مگر ایک مسلمان کا کام یہ نہیں کہ وہ صحابہ کے مثالب میں آنے والی اس طرح کی ہر روایت کو آنکھیں بند کر کے قبول کرلے۔ ان روایات پر صحابۂ کرام کی ان صفات کی روشنی میں غور کیا جائے گا جو قرآن حکیم میں مذکور ہیں۔ انہیں اس کردار کی کسوٹی پر پرکھا جائے گا جو ان حضرات کو انسانیت کا گل سرسید بناتا ہے۔ اس طرح کی باتوں کی صحت کے لئے یہی کافی نہیں کہ وہ کسی کتاب میں مذکور ہیں۔ خود مولانا مودودی صاحب قبل ازیں اپنی کتابوں میں اس طرح کی بعض روایات کو یہ کہہ کر ٹھکرا چکے ہیں کہ یہ صحابۂ کرام کے مجموعی کردار سے لگا نہیں کھاتیں۔ مگر صدارتی انتخاب کے معاً بعد خدا جانے وہ کون سی تبدیلی واقع ہو گئی ہے کہ آج وہ صحابہ کی تفتیش میں پیش ہونے والی ہر روایت کو بڑھ بڑھ کر بطور سند پیش کر رہے ہیں۔ بتایا جائے کہ اگر خلفائے راشدین بھی انہی نقائص اور عیوب کا مجموعہ تھے۔ ان کے ہاں بھی اقربا پروری ہوتی تھی تو پھر اسلامی نظام کے مطالبہ میں جان کیا باقی رہ جاتی ہے۔

کیا مولانا مودودی صاحب مطمئن ہیں کہ ان کے پاس جو ٹیم ہے وہ حضرت عثمانؓ سے زیادہ باکردار اور باصلاحیت ہے اور وہ اس نظام کو ان خرابیوں کا شکار نہیں ہونے دے گی۔

مولانا مودودی صاحب کی مشکل یہ ہے کہ ایک طرف وہ ایک جماعت کے واحد لیڈر ہیں

اس سے اتفاق ہو:

(مگر وقت یہ ہے کہ مودودی صاحب کے ذاتی اور جماعتی نظریات میں کوئی حدِ فاصل نہیں وہ جو لکھتے ہیں جماعتی لٹریچر کا حصّہ بن جاتا ہے۔ کارکن انہیں پڑھتے ہی نہیں پھیلاتے بھی ہیں۔ جماعت کے حلقوں میں مودودی صاحب کے کسی تفسیری، فقہی یا اجتہادی نظریہ پر تنقید عملاً جرم ہے جو افراد یہ غلطی کرتے ہیں انہیں جماعت کا مزاج زیادہ دیر تک برداشت نہیں کرتا)

اس طرح مودودی صاحب کی نظریاتی انفرادیت جہاں اپنی جماعت کے لوگوں میں عصبیت پیدا کرنے اور انہیں ایک فرقہ کی طرح مجتمع اور منظم رہنے میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہے وہاں عام مسلمانوں میں ان کی لیڈری کے لئے سخت نقصان دہ بھی بن جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جماعت اسلامی اپنے دلکش نصب العین کے باوجود ملکی اور قومی لحاظ سے ایک بے اثر تنظیم ہے۔ اس کے پرانے ارکان آہستہ آہستہ جماعت سے نکلتے تو رہیں گے مگر اب جماعت میں نئے افراد کے داخلہ کی کوئی امید نہیں

مولانا مودودی نے بیٹھے بٹھائے بلا ضرورت اور اچانک (اور شائد اب کوئی اور کام نہ پاکر) حضرت عثمان غنیؓ کو جس طرح نشانۂ تنقید بنایا ہے۔ ہمارے خیال میں اس کے بعد اہل سنت کے ذریعے ان کی 'تاج پوشی' کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔ مسلمان لاکھ گناہ گار ہو مگر صحابہ سے سوئے ظن رکھنے والوں یا ان پر اس طرح کی سنگدلانہ تنقید کرنے والوں کو اپنا رہنما نہیں بنا سکتا۔

کیا جماعتِ اسلامی کے حلقے میں کوئی ایک 'رجلِ رشید' بھی ایسا نہیں جو مولانا موصوف کو اس 'گناہ بے لذت' سے باز رکھ سکے؟

شہاب

آپ کا گرامی نامہ ملا غنیمت ہے کہ آپ نے مولانا مودودی سے ہمارے اس اختلاف کو دیانت پر مبنی قرار دیا۔ ورنہ آپ کی جماعت کے اکثر حضرات نے تو اس پر ہمیں وہ بے نقط سنائی ہیں کہ خدا کی پناہ ـــــ معلوم ہوتا ہے جماعت اسلامی کے لوگ مولانا موصوف کی اندھی تقلید کے اتنے خوگر ہو چکے ہیں کہ وہ کسی بھی دینی مسئلہ پر ان کا نقد و احتساب برداشت نہیں کر سکتے۔ حیرت ہے ایک طرف یہی لوگ حریت فکر کے اتنے بڑے داعی ہیں کہ صحابہ کرام کو بھی تنقید سے بالاتر نہیں سمجھتے اور دوسری طرف وسعت ظرف اور رواداری کا یہ عالم ہے کہ وہ اپنے امیر کے خیالات سے مودبانہ اختلاف بھی گوارا نہیں کرتے۔

آپ نے حضرت عمر فاروق کے جس قول کا حوالہ دیا ہے اور جسے مولانا مودودی صاحب نے حضرت عثمان غنیؓ پر تنقید کرنے کی بنیاد بنایا ہے ہمارے نزدیک وہ سراسر وضعی اور بے بنیاد ہے اور ہم اسے عمر فاروق کا قول سمجھنے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہو سکتے۔ آپ نے تو مودودی صاحب کا مشہور مضمون 'مسلک اعتدال' پڑھا ہوگا وہ ایک 'مزاج شناس رسول' کو یہ حق دیتے ہیں کہ وہ مضمون کو اپنے وجدان کی کسوٹی پر پرکھے اور اگر وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اس طرح کی بات رسول اللہ کی زبان فیض ترجمان سے نہیں نکل سکتی تو اسے بلا ادنیٰ تامل حدیث رسول ماننے سے انکار کر دے ـــــ یہ ارشاد ان کا اس روایت کے بارے میں بھی ہے جس کے راوی ثقہ ہوں اور جو ہر اعتبار سے اصول حدیث پر پوری اترتی ہو۔

ہماری سمجھ میں ابھی تک یہ بات نہیں آسکی کہ ایک طرف تو آپ حضرات اتنے فیاض ہیں کہ ارشادات رسول تک کے لئے آپ لوگوں نے یہ اصول بنا دیا ہے مگر دوسری طرف تاریخ کے جھوٹے سچے اقوال کے لئے آپ نے کوئی کسوٹی مقرر نہیں کی۔ اس سلسلے میں آپ ہر رطب و یابس کو وحی آسمانی قرار دینے کے لئے ہر وقت آمادہ رہتے ہیں۔ اگر آپ حضرت عمر فاروق کی طرف منسوب اس قول کا تجزیہ کرنے میں کامن سنس (عقل عام) ہی کو استعمال فرما لیتے تو اس کا غلط ہونا آپ

فصل ـــــ ۴

خلافت وملوکیت
ایک پراپیگنڈہ پمفلٹ ہے

ہفت روزہ "ایشیا" کا ۲۰ اگست کا شمارہ ہمارے سامنے ہے اور ہم بڑی توجہ کے ساتھ اس کا اداریہ "خلافت وملوکیت" پڑھ رہے ہیں۔ ہمیں محسوس ہو رہا ہے کہ محترم اداریہ نگار حمایت اور پارٹی پسندی کے جوش میں دلچسپ قلابازیاں کھا رہے ہیں اور اس عینک کو ہر آنکھ پر پیوست کر دینا چاہتے ہیں جو ان کی اپنی آنکھ کی زینت ہے۔ وہ پسند کرتے ہیں کہ ہر آدمی دنیا کو اسی عینک سے دیکھے اور چاہتے ہیں کہ ان کے جانب دار ذہن نے اپنے مخصوص نقطۂ نگاہ سے جو کچھ سمجھا سوچا اور جانا ہے وہ ہر آدمی کے حلق میں اتار دیا جائے اور اس طرح مولانا مودودی کے نعرہ "انا ولاغیری" کا پرچار کر دیا جائے۔

محترم اور مکرم ہفت روزہ ایشیا کا یہ جمہوری حق ہے وہ جتنا چاہیں اور جتنے زور سے چاہیں اپنی پارٹی (اور ان کی پارٹی کے مفہوم میں مولانا مودودی کے سوا دوسرا کوئی فرد شامل نہیں) کی ہر لغزش کو خوبی اور ہر سیاسی چال کو علمی تحقیق ثابت کرنے کی کوشش فرما سکتے ہیں۔ یہ ہمیشہ

قابلِ صد احترام بزرگ اور جید علماء موجود تھے جو ناوکِ جبر سے خود چھد چکے ہیں اور خوب جانتے ہیں کہ علمی تنقید کے حدود کیا اور اس کو کہاں تک آزادی حاصل ہے۔ تعجب ہے کہ ان بزرگوں کی موجودگی میں علمی اختلاف کو دبانے کے لئے جبر سے استمداد کی گئی ہے ..... کیا وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر یہ بتانے کو تیار ہیں کہ اس کتاب کی ضبطی کا مطالبہ ان کی دیانت دارانہ رائے ہے:

ہم قابلِ صد احترام اور جید علما کی 'دیانت' پر شبہہ کرنے کے اس خالص صالحانہ انداز کے مضمرات سے بحث نہیں کریں گے۔ اس قسم کی ملفوف گالیاں ان جدید صالحین کی نئی ادا نہیں کہلا سکتیں لیکن ہم صاحبِ موصوف کی خدمت میں یہ سوال ضرور عرض کریں گے کہ مستشرقین اور مغربی ممالک کے پادریوں نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین پر اسی نوع کے جو اعتراضات کئے ہیں اور جن کی تائید و حمایت کرنے کے سوا مولانا مودودی کی تالیف "خلافت و ملوکیت" نے دوسری کوئی خدمت انجام نہیں دی۔ ان کے متعلق صاحبِ اداریہ کیا فتویٰ دیتے ہیں کیا گزشتہ ڈیڑھ صدی میں 'علم عقل اور نقل' کے تمام تیر ان پر کوئی اثر کر سکے ہیں جواب ہوگا جس تالیف کا مقصد محض اپنے مزعومات کی تائید۔ اپنی انا کی تسکین اور اپنے دعوؤں کے لئے قدما سے تصدیق حاصل کرنا ہو۔ اس کو 'علم عقل اور نقل' کے معیار پر پرکھنا چہ معنیٰ اور اسے علمی تحقیق بتانا کیا؟ یہ دھول تو پرانے زمانے کے پادری برسوں سے ہماری آنکھوں میں جھونکتے رہے ہیں۔ سینا رتھ پرکاش علمی تحقیق ہی کے طور پر پیش ہوئی تھی۔ صاحب اداریہ تو ہمیں اس سے معاف فرماتے اور اپنے آپ کو ان محققین کے 'مقتدیوں' میں شامل ہونے سے بچا لیتے۔

پھر فرماتے ہیں:۔

"بہت کم دیکھنے میں آیا کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ دینی طبقے سے کسی معاملہ میں

اس کی مخالفت سیاسی بنا پر کی ہے اور اس پر یہ الزام لگایا ہے کہ یہ کتاب موجودہ نظام کے خلاف مخفی دعوتِ بغاوت دیتی ہے۔ لیکن اس الزام کی رد میں جو کچھ کہا گیا اس کا لب لباب مقالے ہی کے ایک فقرے میں یہ ہے:۔

"اگر امام ابو حنیفہؒ نے دین کی اسی تعلیم کی بنا پر اپنے زمانے کے مخصوص سیاسی حالات میں تبدیلی کا کوئی مشورہ دیا تھا اور اس کو آج اسلام کے نظام حکومت میں سیاسی تبدیلیوں کی تشریح میں بیان کر دیا گیا ہو تو کیا غضب ہو گیا ہے"

یعنی جدید تعلیم یافتہ طبقہ نے اعتراض تو سولہ آنے درست کیا ہے لیکن اس میں حرج ہی کیا ہے۔ پھر جواز اس کا یہ بتایا ہے کہ آج بھی اپوزیشن کو یہ حق دیا جاتا ہے اور پاکستان کے ہائیکورٹ اور سپریم کورٹ نے اس حق کو تسلیم کیا ہے کہ اپوزیشن حکومت کے خلاف پراپیگنڈہ کر سکتی ہے۔ اپنے اس جواز کو ثابت کرنے کے لئے صاحبِ مقالہ نے ہائی کورٹ کے کئی "رولنگ" پیش کئے ہیں لیکن اپنے استدلال کے منطقی نتیجے کو واضح نہیں کیا اور کھل کر یہ نہیں کہا کہ خلافت وملوکیت بھی ایک طرح سے پراپیگنڈہ پمفلٹ ہے جسے نہایت ہوشیاری سے تحقیق کے لفافے میں لپیٹ دیا گیا ہے۔ اسے ضبط کرنا اپوزیشن کے پراپیگنڈہ لٹریچر کو ضبط کرنا ہے۔ اور ہائیکورٹ کی رولنگ کے مطابق غلط ہے۔ علماء اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ خواہ مخواہ سر کھپا رہا ہے۔

باب ششم

سلام کی اجارہ داری

• ماءُ اللحم دو آتشہ ———— ۱۵۳

مارا للحم دوآتشہ

ہمارے ایک کرم فرما نے ہمیں معاصر ایشیا لاہور کی ۱۵ جون ۱۹۶۵ء کی ایک اشاعت کا تراشا ارسال فرمایا ہے اور ہم سے مطالبہ کیا ہے کہ اس پر اظہار رائے کریں۔ اس تراشے میں جماعت اسلامی کے شعبہ نشر و اشاعت کے سربراہ ابوالاسلام نعیم صدیقی کی ایک تقریر کی رپورٹ درج ہے۔ جو موصوف نے جماعت اسلامی کے تربیتی پروگرام (حلقہ لاہور) کے ایک جلسہ میں کی تھی۔ اور اس میں مخاطبوں کو یہ تربیت دی تھی کہ وہ اللہ کے منتخب بندے ہیں اور اللہ نے ایمان کامل اور دین کی خدمت کے جذبے کے جملہ حقوق انہی کے نام محفوظ کر دیے ہیں۔ جماعت میں شامل ہو جانا ہے گویا حزب اللہ میں شامل ہو جانا اور جماعت کے باہر کے تمام لوگوں کو چیلنج کرنا ہے جو ایک طرح سے احزاب الشیطان میں شامل سمجھے جا سکتے ہیں۔ مولانا نے ایک گرانقدر تقریر میں فرمایا تھا کہ اس طرح تمام مسلمانوں کو چیلنج کرنے کے راستے میں لاتعداد دشواریاں بے شمار رکاوٹیں اور طرح طرح کی مشکلات ہیں۔ لیکن اگر تحریک کے ساتھ وفاداری اتنی اٹل اور غیر متزلزل ہو کہ

نے عزیز کے ایمان کو ٹھوک بجا کر دیکھنے کے بعد اس کی کمزوریوں اور کجیوں کی نشاندہی کر کے ورکشاپ میں بھیجنے کی تجویز کی ہے اس پر یہ بد کے ہیں اور انہوں نے قبلہ ابوالاسلام صاحب کی تقریر کی پرانی رپورٹنگ نکال کر ہمارے ذمے یہ ڈیوٹی لگائی ہے کہ وہ ان کی جگہ ان کے غصے کا اظہار کر دے اور ان کی طرف سے "وما علینا الا البلاغ" کا نعرہ لگا دے لیکن ہم خود کو اس کا اہل نہیں پاتے

وجہ یہ کہ ہم کو جماعت اسلامی کے طرز فکر میں کوئی اچنبھے کی بات نظر نہیں آتی۔ یہ عام ذہنی رویہ ہے جو ہر سطح پر موجود ہے اور اس میں کہیں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی اگر آپ پسند کریں تو تاریخ اٹھا کر دیکھ لیجئے جماعت اسلامی کے کسی رکن سے مماثلت مقصود نہیں صرف عملی سطح پر تقابلی مطالعہ کی خاطر اندازہ فرمایئے کہ وہ کونسا جذبہ تھا جس نے مثلاً ابوجہل کو مکہ کی وادیوں میں شعلۂ جوالہ کی طرح گھمایا اور آخر میدان بدر تک پہنچا دیا۔ اس کو بھی چھوڑیے اور تاریخ کو آگے بڑھایے جھوٹے نبیوں کی ایک بہت بڑی کھیپ جدید ترین تاریخ تک آتی نظر آتی ہے اس کے پس منظر میں کونسا جذبہ کارفرما ہے۔ ان نبیوں کے "الہامات" میں کس ذہنی رویے کی جھلک ہے جس سے طبیعت ابا کرتی ہے، یہ مطالعہ بھی اگر پسند نہ ہو تو تحریکوں کی تاریخ پڑھ لیجئے۔ مثال کے طور پر اسلام کی تاریخ میں ایک بڑی نمایاں تحریک "خوارج" کی تحریک تھی۔ ان کے کسی فرد میں یہ جذبہ نظر نہیں آتا۔ وہ کونسا خوش قسمت ہے جس نے اپنے آپ کو "حزب اللہ" کا رکن نہیں سمجھا اور دوسروں کو "احزاب الشیطان" کا نام نہیں دیا۔ حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت علیؓ بن ابی طالب کے قاتلوں میں سے کون تھا جس نے اپنے آپ کو "احزاب الشیطان" کا رکن سمجھ کر اور شیطان کی قوتوں کی نصرت کرنے کے شعور کے ساتھ ان بزرگوں پر حملہ کیا اور ان کی قیمتی جانوں سے دنیائے اسلام کو محروم اور عالم اسلام کی وسعتوں کو محدود

فرد یا افراد کی جماعت اپنے آپ کو دوسروں سے برتر اور اعلیٰ نہ سمجھے تو پھر علیحدگی ہی کیوں اختیار کرے اور اپنے لیے علیحدہ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد کیوں بنائے یہ بنیادی طور پر احساس برتری اور دوسروں کے مقابلے میں اپنی بہتری اور عظمت ہی کا جذبہ ہے جو ایک فرد یا چند افراد کو دوسروں سے علیحدہ "ہم خیال" گروہ میں جمع کر دیتا ہے۔ اگر اس ہم خیالی کا تجزیہ کیا جائے تو ثابت ہوگا کہ اس کی بنیادی قدر مشترک احساس برتری ہی ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ علیحدگی کے محرکات میں ذاتی یا جماعتی مفادات بھی محرک کی حیثیت سے شامل ہوتے ہیں۔ مثلاً پاکستان کی شکل میں علیحدہ ہو جانے کے جذبے میں جہاں ہم میں من حیث القوم ہندو قوم سے برتر اور بہتر قوم ہونے کا شعور موجود تھا وہاں مفادات کے تحفظ اور حصول کی امید کو بھی قلم زن نہیں کیا جا سکتا۔ اس طرح جب کوئی علیحدہ جماعت وجود میں آتی ہے تو جذبے کے پہلو بہ پہلو مفاد بھی موجود ہوتا ہے۔ اس سے صرف نظر ممکن نہیں ہوتا مفاد کو خواہ یہ نظریاتی ہو یا مادی محفوظ رکھنے کے لیے اراکین میں تحریک کے ساتھ وفاداری اور غیر مشروط اور چپ و راست پر نظر نہ رکھنے والی وفاداری کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہر تحریک کا یہ خاصا ہے وہ اپنے ارکان سے غیر مشروط وفاداری طلب کرتی ہے۔ اور اس کے بغیر تحریک کا کوئی مقصد ہی پورا نہیں ہوتا اس کی نہایت واضح اور بڑی شد بد مثال ہماری تاریخ میں حسن ابن صباح کی تحریک ہے قلعہ الموت سے وفاداری ہر وفاداری سے بڑی تھی یہاں تک کہ گھر بار بیوی بچے۔ عزیز رشتہ دار۔ دوست احباب سب اس وفاداری کے سامنے ہیچ ہو جاتے ہیں۔ فدائی کا خنجر قلعہ الموت کے حکم کا اندھا بہرہ تابع تھا اور کسی بھی سینے میں بغیر چوں و چرا کے اتر سکتا تھا مختلف تحریکوں میں یہ شدت مختلف مدارج میں نظر آتی ہے۔ جماعت اسلامی بھی ایک ایسی جماعت ہے۔ دوسروں سے علیحدہ ہو کر اور کٹ کر ایک منفرد صورت میں مجتمع ہوئی ہے۔ اگر یہ اپنے آپ کو "مالم دو آتشہ" کہتی ہے تو اس میں کونسی بات عجیب ہے۔

باب ہفتم

کیا جماعت اسلامی اِنتخابی مہمات پر زکوٰۃ صرف کر سکتی ہے؟

● زکوٰۃ اور اس کا سیاسی مصرف ـــ ـــ ـــ ١٦١

زکات ـــــ اور
اس کا سیاسی مصرف

"مدیر شہاب" نے جماعت اسلامی میں رہتے ہوئے اصلاح احوال اور اتمام حجت کی خاطر جو تفصیلی مکتوب میر جماعت اسلامی محترم مولانا مودودی کی خدمت میں تحریر کیا تھا اس کے جواب میں مولانا محترم نے مکتوب نگار سے استعفیٰ طلب کر لیا تھا اور اپنی دوسطری تحریر میں بڑے ہی درد بھرے لہجے میں ارشاد فرمایا تھا کہ :

آپ (مدیر شہاب) جماعت سے مستعفی ہونے کے بعد مجھ
پر جو عنایات فرمائیں گے میں ان پر (اپنے معمول کے
مطابق صبر کرونگا

مدیر شہاب نے جماعت سے نکلنے کے بعد مولانا محترم پر اسکے سوا اور کوئی عنایت نہیں کہ اس نے صورت حال کی وضاحت کے لیے اپنی خط و کتابت اخبارات کے حوالے کر دی۔ اس کے بعد آج تک کسی تقریر اور تحریر میں جماعت پر تنقید نہیں کی گئی کہ

آج تک کبھی یہ اعتراض نہیں کیا۔ البتہ جماعت سے علیحدگی
اختیار کرنے کے بعد بعض ایسے لوگ اس اعتراض کو اچھال
رہے ہیں جو خود سالہا سال تک نہ صرف یہ کہ زکوٰۃ کی رقوم
اپنے ہاتھوں سے جمع اور خرچ کرتے رہے ہیں بلکہ جماعت
کے بیت المال سے معاوضے بھی لیتے رہے ہیں"

اور مذکورہ بالا یہ ارشاد اس تمہید کا بولتا ہوا نتیجہ ہے کہ۔

"اب یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ ان کی نیت میں پہلے فتور
تھا یا اب آگیا ہے۔"

جو شخص بھی ان ارشادات کے سیاق و سباق پر غور کرے گا وہ بلا تامل یا بادنیٰ تامل معلوم کرے گا کہ مولانا جمع کے صیغہ میں جن بہت سے لوگوں کے تذکرہ کا تکلف فرما رہے ہیں اس میں ان کا اصل ہدف یہی "شہاب" کا ناہنجار اور گناہ گار رائیڈیٹر ہے۔ وہ ہمارے بزرگ ہیں ورنہ ہم ان کی خدمت میں یہ مشہور شعر پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتے کہ۔

خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں
صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں

ان سطور کا راقم اختلافات کے باوجود مولانا کا احترام کرتا ہے اس لیے یہ زیب نہیں دیتا کہ ان کے اس طرح کے ارشادات کا پوسٹ مارٹم کیا جائے یا جواب آں غزل کے طور پر ان کی ذات کو نشانۂ تنقید بنایا جائے وہ گالیاں بھی دیں تو انہیں حق پہنچتا ہے ہم انشاء اللہ اف نہیں کریں گے۔ جب سالہا سال تک ان کی زبان سے کلمات تحسین و آفریں سنتے رہے ہیں تو اب دو چار خفگی کے بول بھی سہی۔ ہمارا یہ منصب نہیں کہ ان سے یہ گستاخانہ سوال کریں کہ۔

جو عہدہ دار جماعت کے نظم کا وفادار رہتے ہوئے جماعت کے اپنے تجویز کردہ طریق کار کے مطابق کسی پالیسی کو تبدیل کرانے کی کوشش کرتا اور اس مقصد کے لیے جماعت کی مجاز کونسل کے سامنے اظہار خیال کرتا ہے اور وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب نہیں ہوتا تو اسے کسی بھی منصب پر رہنے کا حق حاصل نہیں رہتا۔ خواہ وہ ہزار یقین دلائے کہ صاحبو۔ ہر چند کہ تم نے میری بات تسلیم نہیں کی مگر میں اس کے باوجود اسی پالیسی کے مطابق جماعت کی نمائندگی کرنے پر تیار ہوں

دوسری جزئیات و تفصیلات تو رہیں ایک طرف۔ تنہا اسی سوال کا جواب مل جائے تو اہل نظر فیصلہ کریں گے کہ جماعت میں جمہوریت ہے یا آمریت ۔ مگر جیسا کہ ہم نے عرض کیا۔ اب یہ بحث ہمارے دائرہ کار سے خارج ہے جماعت کے کارکن تو بیچارے مرضیٔ یار کے لیے اس سے بھی بڑی پابندیاں برداشت کرنے کے لیے تیار ہیں ہم کون ہیں جو دخل در معقولات دینے کی کوشش کریں ۔ ہمیں تو بات مسئلہ زکوٰۃ کی کرنی ہے کہ دین پر کسی کی اجارہ داری نہیں اور اس کا تعلق محض مولانا محترم کی جماعت سے نہیں تمام مسلمانوں سے ہے۔

مولانا نے یہ تو تسلیم فرما لیا کہ ہم عشر و زکوٰۃ کو اپنی سیاسی و انتخابی مہمات پر صرف کرتے ہیں۔ یہ بھی کہا کہ یہ ہمارے نزدیک بالکل جائز اور مباح ہے مگر اس کے لیے انہوں نے قرآن و حدیث سے کوئی دلیل پیش نہیں کی محض یہ کہہ دینا، کہ جماعت جہاد کر رہی ہے اور جہاد چونکہ فی سبیل اللہ کی مد میں شامل ہے اس لیے اس پر زکوٰۃ بھی خرچ ہو سکتی ہے۔ ان لوگوں کو تو مطمئن کر سکتا ہے جو "مستند ہے انکا فرمایا ہوا" کے قائل ہیں لیکن اس سے عام مسلمانوں کی ہرگز تسلی نہیں ہو سکتی جو دین میں کسی لیڈر اور عالم کو حجت ماننے کی بجائے صرف کتاب و سنت کو حجت تسلیم کرتے ہیں۔

ہر ایک کو معلوم ہے کہ "سلطان جابر" کے سامنے کلمۂ حق کہنا افضل جہاد ہے اور یہ

دی ہے کہ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے غزوات اور خلفائے راشدین کے معرکہ ہائے جہاد میں بھی تو زکوٰۃ اور عشر کی رقمیں خرچ کی جاتی تھیں۔ آخر ہم انہیں انتخابات وغیرہ پر کیوں خرچ نہ کریں۔

ہم تو سچ پوچھیے یہ نظریہ پڑھ کر کانپ ہی گئے۔ کہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خلفائے راشدین اور صحابۂ کرام کے جہاد اور کہاں یہ گندے انتخابات جن میں جماعت نے فساق و فجار کی بھی علی اعلان حمایت کی۔ ان لوگوں کو بھی ووٹ دیئے دلائے جن کے شب و روز زنکاری اور شراب نوشی میں بسر ہوتے ہیں۔ اس نظریہ کا ترجمہ تو یہ ہوا کہ العیاذ باللہ خاکم بدہن عہد نبوی کے غزوات و ہی مرتبہ و حیثیت رکھتے ہیں جو جماعت اسلامی کی انتخابی مہمات ــ اور آج ان انتخابات میں جو لوگ جماعت کے مدمقابل ہیں وہ ویسے ہی ہیں جیسے بوجہل و بولہب ــ کاش۔ یہ حضرات اس بات کو فراموش نہ کرتے کہ زکوٰۃ اسلام کا ایک رکن اور دین کا ایک بنیادی فریضہ ہے۔ قرآن و سنت نے اس کے لیے مصارف کی باقاعدہ مدات معین کی ہیں ان میں ترمیم کرنا دین میں تحریف کرنے کے برابر ہے۔ دین کوئی سائنس نہیں کہ آپ اس میں نئے نئے نظریات ایجاد کر کے داد و تحسین حاصل کریں۔ آپ سچے ہیں تو ادب و انشا اور فصاحت و بلاغت کے چٹکلوں کی بجائے اپنے نظریہ کی تائید میں قرآن و حدیث کی نصوص، امت کا تعامل اور آئمہ و فقہا کے افکار پیش فرمائیں۔

مولانا محترم کا یہ طعنہ تو بڑا ہی لاجواب اور ان کے صبر کا بڑا ہی شاندار مظہر ہے کہ۔

سیاسی اور انتخابی مہمات اور ہمہ وقتی کارکنوں کے لیے زکوٰۃ خرچ کرنے پر اعتراض وہ اصحاب کر رہے ہیں جو خود سالوں جماعت کے بیت المال سے

اس لیے محل نظر ہے کہ وہ خود چوری کرتا رہا ہے؟ جس نے آج داڑھی رکھی ہے کیا داڑھی کے حق میں اس کی بات اس لیے بے وزن ہے کہ وہ کل تک خود داڑھی منڈاتا رہا ہے۔

بتایا جائے کہ اس منطق کو اسلام سے دور کا بھی تعلق ہے؟

اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو پھر جماعت سے نکلنے والے گناہ گاروں کو یہ طعنہ دینا تقویٰ کی کون سی قسم میں داخل ہے کہ چونکہ تم نے خود ایک عرصہ تک جھک ماری ہے اس لیے ہمیں بھی جھک مارنے کا پورا پورا حق حاصل ہے۔

جیسا کہ ہم نے عرض کیا زکوٰۃ دین کا بنیادی فریضہ ہے اس کی رقوم انتخابات کی مہموں، لیڈروں کے عمرانوں اور ہمہ وقتی کارکنوں کی تنخواہوں وغیرہ میں صرف کرنا قیامت کی جوابدہی کا بہت بڑا بوجھ سر پر اٹھانے کے مترادف ہے۔ یہ جدید نظریہ غرباء کے منہ سے رہے سہے لقمے بھی چھین کر رہے گا اور سیاسی پارٹیاں اس مقدس سرمائے کو حصول اقتدار کا ذریعہ بنالیں گی ہم جماعت کے ذاتی اور گروہی معاملات سے کوئی تعرض نہیں کرنا چاہیے ہماری طرف سے ایک دفعہ وضاحت ہوگئی وہی کافی ہے۔ لیکن جہاں معاملہ دین اور مصالح دین کا ہوگا وہاں ہم خاموش نہیں رہ سکتے۔

باب ہشتم

بدزبان اور بداخلاق کون ہے؟
مولانا ہزاروی یا
جماعتِ اسلامی کے صالحین

صالحین کے اخلاق کے نمونے ---- ۱۷۳

صالحین کے
اخلاق کے نمونے

کچھ عرصہ سے جماعت اسلامی اور مولانا غلام غوث ہزاروی کا ایک مناقشہ زوروں پر
،۔ مولانا ہزاروی نے کسی جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے مولانا مودودی پر یہ الزام لگایا کہ
امریکی امداد لے رہے ہیں اس پر جماعت کے جنرل سیکرٹری صاحب نے خدا خوفی اور
اقِ عالیہ کا وعظ کرتے ہوئے مولانا غلام غوث ہزاروی اور دوسرے علماء کو خوب
ڑا اور ارشاد فرمایا کہ یہ لوگ بدزبان ہیں اور اخلاق اور سلیقے سے اختلاف کرنا بھی نہیں جانتے
جو لوگ جماعت کے طریقِ کار پر گہری نظر رکھتے ہیں انہیں خبر ہے کہ اس کے رہنمایان
م آسانی سے کسی بات کا نوٹس نہیں لیتے اور عام طور پر یہی ظاہر کرتے ہیں کہ وہ اس طرح
مخالفتوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتے لیکن مولانا ہزاروی کے جواب میں جماعت کے
پاکستان قیم صاحب کا بیان اور پھر اس بیان کا پمفلٹ کی صورت میں شائع ہو کر ملک
میں تقسیم ہونا اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ تکلیف کچھ زیادہ ہی پہنچی ہے جو یہ دھائی
، جا رہی ہے اور وہ تکلیف اصل میں یہ ہے کہ کئی مقامات پر جماعت کے جلسے اُلٹ دیئے

گمراہ سمجھتے ہیں اور ان کے پیچھے نماز پڑھنے کو ناجائز قرار دیتے ہیں ایک دینی اور علمی مسئلہ ہے اور اس میں مولانا ہزاروی کی ذات منفرد نہیں ہے۔ حضرت مولانا حسین احمد مدنی، حضرت مفتی کفایت اللہ، حضرت مولانا احمد علی لاہوری، حضرت مولانا ابوالبرکات، حضرت مولانا قاضی مظہر حسین اور کتنے ہی دوسرے بزرگوں کے نام اس فہرست میں شامل ہیں جن کا یہی فتویٰ ہے لیکن اس کے یہ معنی تو نہیں ہیں کہ جماعت اسلامی جواباً مولانا ہزاروی اور مذکورہ بالا علماء کو سکھ بنا دے اور ان پر شراب نوشی کا اتہام لگائے اور بدتمیزی اور بداخلاقی کا مظاہرہ کرے جیسا کہ ایشیا نے کیا ہے۔

"یہ لوگ جس مقرر کو بھی اپنے ہاں بلاتے ہیں وہ سکھوں کی روایات کا پاس کرتے ہوئے اس طرح جامے سے باہر ہوتا ہے کہ عوام تالیاں پیٹتے ہیں۔"

"وہ (یعنی مولانا غلام غوث) مولانا مودودی کا نام اپنی زبان پر لاتے ہی قابو سے باہر ہو جاتے ہیں۔ لیکن خاص ٹوبہ ٹیک سنگھ میں انہیں دیکھئے تو آپ محسوس کریں گے کہ وہ کئی پیگ چڑھا کر بول رہے ہیں۔"

"ہزاروی صاحب کی تقریر جوں ہی ختم ہوئی۔ اسٹیج کے قریب بیٹھے ہوئے کمیونسٹ اور جمعیۃ علمائی گرگے اٹھ کھڑے ہوئے مفتی صاحب کو اتنی مہلت بھی نہ مل سکی کہ ہزاروی صاحب کی ہفوات کی تردید فرما سکتے"

یہ کچھ دن ہوئے عباسی صاحب نے جناب مولانا مودودی کی طرف سے صحابہ کرام پر تنقید کے جواب میں کتاب لکھی تو اس کا نام رکھا "تبصرہ محمودی بر ہفوات مودودی"۔ اس پر جماعت کے حلقوں میں شور مچ گیا کہ یہ کیا بدتہذیبی اور بداخلاقی ہے کہ مودودی صاحب کی تنقید کو ہفوات کا نام دیا گیا ہے حالانکہ یہ تنقید پھر صحابہ کرام پر تنقید تھی مگر یہاں دیکھئے مولانا ہزاروی نے مولانا مودودی پر تنقید کی اور اسے بلا تکلف ہفوات کا نام دیدیا گیا ہے۔)

"آپ اب بھی دیکھ ہی لیجئے کہ داعیان حق کی مخالفت کے لیے شیطان کیسے کیسے مرداروں کو تیل مالش کر کے کھڑا کرتا ہے۔"

اخلاق کا یہ مظاہرہ تو جمعیتہ العلماء کے باب میں ہوا۔ اب ذرا مولانا غلام غوث ہزاروی کے معاملے میں صالحیت بابی ملاحظہ فرمایئے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

"شیطان کے کمال فن کی داد دیجئے کہ جب وہ کسی اچھے خاصے مرد معقول اور عالم و فاضل شخص کی سواری گانٹھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو پھر اس بدنصیب کے دماغ کی چولیں کچھ ایسی ڈھیلی کر دیتا ہے کہ کسی بھی لمحے وہ عین بازار میں کپڑے اتار پھینکتا ہے اور ننگا ناچتے ہوئے فخر و غرور کے ساتھ لوگوں کو للکارتا ہے۔"

"کسی بھی لمحے وہ بھنگ پینے کی طرح بذیان بکنا شروع کر دیتا ہے۔ کسی بھی لمحے اس کی انسانی بولی درندوں کی عف عف میں تبدیل ہو جاتی ہے۔"

"اب اس مصیبت کو کیا کیجے کہ شیطان لعین نے جناب کے کاسۂ سر میں اپنے تخم خاص کی ریزش کر دی اور یہ تخم بار آور ہوا۔"

"خروش اس غضب کا کہ منہ میں جھاگ آجاتے ہیں۔ رگیں پھول جاتی ہیں۔ داڑھی مورچھل بن جاتی ہے۔ یہاں تک کہ بعض مرتبہ قبا کے بند بھی کھل جاتے ہیں۔"

(اس میں داڑھی کے ساتھ جو شعار اسلامی ہے مذاق پر غور فرمایئے۔)

جماعت اسلامی مولانا غلام غوث ہزاروی پر برہم ہے کہ وہ تنقید کرتے ہوئے ذاتیات پر اتر آتے ہیں۔ امریکی امداد کا الزام لگاتے ہیں لیکن ثبوت نہیں دیتے۔ مولانا مودودی جو مفکر اسلام ہیں "کو منشی" کہہ کر پکارتے ہیں انہیں تنقید کا کیا انداز اصل میں اختیار کرنا چاہیے تھا۔ اس کا نمونہ فاضل مدیر "تجلی" نے یوں فرمایا ہے۔

"لطف یہ ہے کہ ہزارے کے مولوی لطف اللہ اور لاہور کے مرزا شریف الدین

باب نہم

کیا مودودی صاحب اور قائداعظم دوست تھے؟

● ایک نیا انکشاف ۔۔۔۔۔۔۔ ۱۸۱

ایک نیا انکشاف

لاہور کے انگریزی روزنامہ "پاکستان ٹائمز" کی ۱۳ر اگست کی اشاعت میں محترمہ مریم جمیلہ صاحبہ اپنے ایک مراسلہ میں فرماتی ہیں کہ :-

"مودودی صاحب کے ساتھ قائدِ اعظم کے تعلقات بڑے خوشگوار اور دوستانہ تھے اور کراچی کے ایک ہفت روزہ جریدے کی اشاعت ۲۷ر ستمبر ۱۹۶۳ء میں یہ انکشاف کیا گیا ہے کہ قائدِ اعظم نے اس بات کی تردید کی تھی کہ مسلم لیگ اور جماعت اسلامی مختلف الخیال جماعتیں ہیں۔ انہوں نے فرمایا تھا کہ ان دونوں تحریکوں کا مقصد ایک دوسرے کی تائید اور ایک دوسرے کے کام کی تکمیل تھا۔"

ہفت روزہ "ایشیا" ۱۳ر اگست کی اشاعت کے سرورق پر جلی الفاظ میں قائدِ اعظم کے ارشادِ گرامی کی اشاعت ہوتی ہے، اس کے نیچے قائدِ اعظم علیہ الرحمتہ کے الفاظ درج ہیں۔ عبارت حسب ذیل ہے۔

قیام پاکستان کے بیسویں سال میں اس محمد علی جناح کو قائداعظم تسلیم کر لیا ہے جس کو ۱۹۴۷ء تک جماعتی حلقوں میں ہٹلر اور مسولینی کہا جاتا تھا۔ چنانچہ مسلم لیگی رہنماؤں کے متعلق مولانا مودودی کے رسالہ ترجمان القرآن ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ کا یہ فتویٰ آج بھی موجود ہے کہ..... یہ مسلمانوں کی قوم میں پیدا ہوئے اس لیے مسلمانوں کی حکومت ان کا نصب العین بن گیا ہے یہی ہندوؤں میں پیدا ہوتے تو موہنجے اور ساور کر بنتے۔ جرمنی میں پیدا ہوتے تو ہٹلر اور گوبرنگ کے روپ میں نمودار ہوتے۔ کسی اطالوی کی آغوش محبت میں جنم لیتے تو مسولینی کی صورت اختیار کرتے۔"

لطف کی بات یہ ہے کہ آج وہ ہفت روزہ ایشیا قائداعظم علیہ الرحمۃ کے الفاظ کے ساتھ اپنے سرورق پر فرمودات جناح چھاپ رہا ہے جس کے ایڈیٹر مولانا نصراللہ خان عزیز نے امیر جماعت اسلامی حلقہ لاہور کی حیثیت سے ایک مرتبہ راقم آثم مدیر شہاب سے اس بات پر جواب طلبی کی تھی کہ اس نے یوم قائداعظم کے موقع پر تقریر کیوں کی ہے۔ ایک محترم رکن شوریٰ کی موجودگی میں انھوں نے یہ ارشاد فرمایا کہ جماعت اسلامی کے کسی رکن کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ یوم قائداعظم کی تقریب میں شرکت کرے اس پر مدیر شہاب نے جو کچھ عرض کیا وہ ایک الگ داستان ہے جو اپنے وقت پر بیان ہوگی۔ ہم صرف یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ جماعت اسلامی آج اپنے نظریات میں کس قدر تقیہ سے کام لے رہی ہے

ہمیں اس بات پر اعتراض نہیں کہ یہ کایا کلپ کیوں ہوئی اور "مسلمانوں کی کافرانہ حکومت" والے ملک کے ساتھ یہ محبت اور اس ملک کے بانی کے ساتھ یہ قرابت کیوں پھوٹ پڑی۔

یہ تو بہرحال ہوتا تھا۔ پاکستان مولانا محترم کے اختلاف مزاج کے باوجود وجود میں آیا اور ان کی مخالفانہ سعی کے باوجود مستحکم ہوا۔

لیکن ہمیں تاریخ کو مسخ کرنے کی کوشش پر شدید رنج ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ پاکستان کی جدوجہد کی تاریخ میں اس قسم کی کوئی آمیزش نہ ہو جو اس کا چہرہ بگاڑ دے اور جس سے

صاحب نے مولانا محترم کو قائداعظم کے پاس یا قائداعظم کو مولانا موصوف کے پاس دیکھا ہو حد یہ ہے کہ یہ حضرت قائداعظم کا کوئی دو لفظی خط بھی اس سلسلے میں پیش نہیں کر سکتے ان میں اتنی ہمت بھی نہیں کہ وہ قائداعظم اور مودودی صاحب کی چند منٹ کی ملاقات ہی ثابت کر سکیں۔ قائداعظم کی حیات اور پاکستان کے حصول کی جدوجہد کے زمانے میں مولانا موصوف اختلاف کے آسان اور بے ضرر راستے سے اپنے آپ کو نمایاں کرنے کی کوششوں میں مصروف تھے اور اس نظریئے کے بہت قائل تھے کہ کانٹا بظاہر حقیر اور ہیچ مقدار ہونے کے باوجود بہت بڑے جسم سے بھی اپنی شخصیت منوا لینے پر قادر ہو سکتا ہے۔ اس صورتِ حال میں مولانا موصوف اور قائداعظم رحمۃ اللہ علیہ کی دوستی چہ معنی ؟

اصل یہ ہے ـــــ اور مولانا مودودی کے قریب رہنے والے اس حقیقت سے باخبر ہیں کہ مولانا مودودی کے خوشگوار اور دوستانہ تعلقات "کبھی کسی سے نہیں ہوئے۔ یہ الفاظ ان کی لغت سے خارج اور یہ جذبہ ان کے دل کے لیئے اجنبی ہے۔ وہ اس نفسیاتی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جن کا ذہنی مسلک ہمچو ما دیگرے نیست' ہوا کرتا ہے اور اسی مسلک کے مطابق وہ اپنوں کے لیے ہمیشہ بیگانے رہے اور انھوں نے اپنے سامنے جلتے ہوئے ہر چراغ کو بجھانے کی کوشش کی ہے۔ اس مزاج کے پیشِ نظر قائداعظم کی مقبولیت ان کے نزدیک ایک "حریف" کی فتح ہو گی جس کے لئے کم از کم رشک کے جذبات کا موجود ہونا عین انسانی جذبہ ہے اس نفسیاتی صورت میں بھی مولانائے محترم کے دل میں قائداعظم کے ساتھ خوشگوار دوستانہ تعلقات کا وجود ناقابلِ فہم ہے۔

اس لئے ہم جماعت کی خدمت میں یہ دردمندانہ گذارش کریں گے کہ وہ محض موجودہ فضا میں اپنے لئے سانس لینے کی گنجائش پیدا کرنے کے سیاسی مسلک کی تکمیل کی خاطر تاریخ کو مسخ نہ فرمائیں۔ اس کے لئے اور بھی بہت سے طریقے اور بے شمار ذرائع ہیں۔ یہ کیا ضروری ہے کہ قومی تاریخ کو مسخ کرنے کا گناہ بھی کیا جائے اور پھر بھی بات نہ بنے۔

باب دھم

اسرائیل اور جماعتِ اسلامی بیک وقت عربوں پر حملہ آور ہوئے

● ناصر دشمنی یا اسرائیل سے ہمدردی -- ۱۸۹

ناصر دشمنی ـــــ یا
اسرائیل سے ہمدردی؟

موقر معاصر جنگ کراچی نے "یہودی سازش" نامی کتاب کی ضبطی" کے زیر عنوان ایک شذرہ لکھا ہے جس کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں

"جماعت اسلامی کے امیر نے ایک بیان میں "یہودی سازش" نامی کتاب کی ضبطی پر احتجاج کیا ہے اور کہا ہے کہ مذکورہ کتاب صرف اس لیے ضبط کی گئی ہے کہ اس کے مصنف جماعت اسلامی کے رکن ہیں۔

امیر جماعت نے یہ بھی کہا ہے کہ اس کتاب کی ضبطی سے دنیا میں یہی تاثر پیدا ہو گا کہ پاکستان میں یہودی اثرات اس قدر غالب ہیں کہ یہاں یہودیوں کی سازش کو بے نقاب کرنے کی جرأت نہیں کی جا سکتی اس کتاب کی ضبطی جس بنا پر کی گئی ہے اسے غلط انداز میں پیش کرنا ایک ذمہ دار عالم کے لیے نہایت قابل اعتراض بات ہے امیر جماعت نے کہا ہے کہ اس کاروائی کے لیے غالباً یہ بہانہ بنایا گیا ہے کہ اس میں صدر ناصر پر تنقید کی گئی ہے حیرت ہے اسے بہانہ کیوں کہا گیا جب کہ واقع یہ ہے کہ ضبطی کا اصل سبب

ساتھ پاکستانی ہمدردی کو نقصان پہنچائے اور پاکستانیوں کے دلوں کو صدر ناصر کی طرف سے الٹا موڑ دے۔ "یہودی سازش" کی تالیف اور طباعت اس نکتے کے لیے ہوئی ہوگی اور ضبطی پر ہنگامہ کھڑا کرنے کی کوشش غالباً اسی مقصد کے تحت کی جارہی ہے۔

ہمارے اس قیاس کی متعدد وجوہ ہیں۔ اس کتاب کو جس انداز میں شائع کیا گیا اور جس طریقے سے اس کی تشہیر کی گئی اس سے یہ ہرگز اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ یہ کتاب جماعت اسلامی ہی کے ترکش سے سر ہوئی ہے۔ اس پر مصباح فاروقی کا نام اور ان کے گھر کا پتہ درج ہے جو غیر معروف آدمی ہیں اور صرف ان کے نام سے یہ شبہہ نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ جماعت اسلامی ہی کا کارنامہ ہے۔ انہیں جماعت کے کارکنوں کے سوا کوئی نہیں جانتا وہ تو خدا مولانا مودودی کا بھلا کرے جنہوں نے احتجاج کے جوش میں یہ بھانڈہ پھوڑ دیا اور دنیا کو پتہ چل گیا کہ یہ کتاب پاکستان کے کسی باہوش اور غیر متعصب صاحب قلم سے نہیں نکلی بلکہ اس پردۂ زنگاری میں جماعت اسلامی موجود ہے۔ ورنہ یہ سچی بات ہے کہ عربوں کو اس بات سے تشویش لاحق ہو جاتی کہ جماعت کے سوا کوئی دوسرا فرد بھی پاکستان میں موجود ہے۔ جو صدر ناصر کو سیاسی گالیاں دے کر اور ان کو بدنام کرنے کی کوشش کر کے عربوں کو ناراض اور پریشان کرنے کے جنون میں مبتلا اور اس طرح پاکستان اور عربوں کے درمیان رخنہ اندازی کا موجب بن رہا ہے۔

مولانا مودودی نے اپنے بیان میں جس بات کا نوٹس بطور خاص لیا ہے اور جس کی طرف معاصر جنگ کی نظر نہیں گئی وہ یہ ہے کہ انہوں نے اس کتاب کی ضبطی کو حکومت کے چند خوشامدیوں کا کرشمہ کہا ہے اور یہ تاثر دیا ہے کہ یہ کتاب ہرگز ضبط نہ ہوتی اگر چند خوشامدی مل کر حکومت کو اس پر مجبور نہ کر لیتے۔ مولانا ممدوح ایک تجربہ کار سیاست دان

تعالےٰ کی صفت عدل اور قانون مکافات پر یقین اور زیادہ راسخ ہوگیا۔ (الحمدللہ) کہ ذلت کے اس عذاب کو آنا ہی چاہیے تھا اور یہ المیہ وقوع میں نہ آتا تو کارکنان قضاوقدر کو حیرت ہوتی۔ وہ جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا زبان سے اقرار کرتے ہوں مگر عملاً اللہ تعالےٰ کے باغی اور نافرمان ہوں انکو صرف اسلام کے نام پر کب تک ڈھیل دی جاتی۔ ضرورت تھی ان کی تنبیہ کی۔ گوشمالی کی۔ ٹھوکر مار کر خواب غفلت سے بیدار کرنے کی۔"

حضرت ماہرالقادری کی اس خیرہ کن جذباتیت کا ہمیں پورا احترام ہے۔ لیکن کیا محترم موصوف سمجھتے ہیں کہ پاکستان کا مسلمان اگر سچ مچ ان کے ان ارشادات سے متاثر ہو جائے اور سمجھنے لگے کہ عرب شرابی۔ لحم خنزیر کی طرف راغب۔ عملاً اللہ کے باغی اور نافرمان ہیں اور اسرائیل ان پر عذاب الٰہی بن کر ٹوٹا ہے تو پاکستانی ان کے اس بحران اور عظیم مصیبت کے دور میں ان کی مدد کرنے پر آمادہ ہوں گے۔ اور اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو کیا حضرت ممدوح کے یہ جذبات صالح ملت اسلامیہ کے لیے مفید ثابت ہوں گے اور موجودہ دور میں اسلامی اتحاد کے تقاضوں اور مصلحتوں کے عین مطابق سمجھے جائینگے۔؟

مولانا تو اللہ تعالیٰ کے فضل سے خود خادم سیرت ہیں۔ غور فرمائیں کہ ملت اسلامیہ پر غزوہ احزاب کا سا وقت ہے۔ دارالاسلام اور اس کے مفہوم میں پورا عالم اسلام شامل ہے۔ چاروں طرف سے دشمنوں میں گھرا ہوا ہے۔ رسالت کا دور نہیں کہ آندھیاں آئیں گی اور دشمنوں کی دیگیں الٹ جائیں گی۔ اس دور میں واعتصموا بحبل اللہ کے سوا ہماری زندگی کا دوسرا کون سا سہارا ہوگا۔ اس وقت میں اگر ہماری صالحیت نے عربوں کے خلاف جوش کھایا تو اس کا کیا نتیجہ ہوگا اور ہم کس رُخ چلیں گے۔؟

ناطقہ سر بگریبان ہے اسے کیا کہیئے۔

باب یازدھم

جماعتِ اسلامی اور وکلاء

● وکلاء کو صالحین کا مشورہ ---- ۱۹۷

وکلاء کو
صالحین کا مشورہ

مؤقر جریدہ ہفت روزہ ایشیا نے اپنی ۸ اپریل کی اشاعت میں میاں طفیل محمد امیر جماعت اسلامی مغربی پاکستان کی ایک تقریر کی رپورٹ شائع کی ہے جو صاحب موصوف نے بار کونسل ساہیوال کے سامنے ۱۸ مارچ کو ارشاد فرمائی تھی اور جس کا بنیادی مقصود تقریر پڑھنے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ وکلائے عظام اپنا کام چھوڑ کر جماعت اسلامی میں داخل ہو جائیں۔ اگر ان کی تقریر خدانخواستہ وکلاء پر کوئی اثر نہ کر سکے تو ملاحظہ ہو مولانا مودودی کا مضمون "راہ رو پشت بہ منزل" جو قیام پاکستان سے پہلے ترجمان القرآن کے کسی پرچے میں شائع ہوا تھا اور اب سیاسی کشمکش حصہ سوم کی زینت ہے۔ اس مضمون کو پڑھ کر حال امیر جماعت اسلامی اور سابق وکیل کپورتھلہ جناب طفیل محمد کے ذہن میں ہلچل مچ گئی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ وہ وکالت ترک کر کے جماعت اسلامی میں داخل ہو گئے اور اب ماشاء اللہ امیر جماعت اسلامی ہیں۔

زیر نظر تقریر کا ایک دلچسپ پہلو وکلاء کے متعلق جماعت اسلامی کے نقطۂ نظر کی تبدیلی ہے۔ جن

ہم نہیں جانتے کہ اس روشن مثال اور تابناک "زندہ دلیل" سے متاثر ہو کر ساہیوال کے کتنے وکیلوں نے اپنے دفتروں میں تالے لگائے۔ بورڈ اتار کر کونوں میں چھپا دیئے اور "منہ طرف اچھرہ شریف لاہور" رواں دواں ہو گئے۔ ہمیں یقین ہے کہ کسی ایک وکیل نے ایسا نہیں کیا ہوگا۔ البتہ میاں صاحب ممدوح کے اس انکشاف پر تالیاں ضرور بجائی گئی ہوں گی اور تالیاں بھی بڑی "ذومعنی" چیز ہے۔ مقرر ان کا کچھ مطلب لیتا ہے اور سامعین کسی اور ہی مقصد سے یہ شغل فرماتے ہیں۔ بہر حال صورت جو بھی ہوئی ہوگی یہ تحریص کسی کام نہیں آئی اور جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے تادمِ تحریر یہ حسین اندازِ تبلیغ نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوا۔

ہمیں اس سے بحث نہیں ہے کہ میاں طفیل محمدؐ نے ساہیوال کا یہ تبلیغی دورہ کیوں فرمایا۔ جماعت اسلامی کے امیر کی حیثیّت سے انہیں پورا حق ہے کہ وہ اپنی بھٹی کے لئے خنگل خنگل ایندھن چنتے پھریں۔ ہمیں تو صرف یہ بات بطور گزارش پیش کرنا ہے کہ پڑھے لکھے لوگوں کے سامنے بات کرتے وقت دو باتوں کا دھیان ضرور کر لینا چاہیئے ـــ اوّل یہ کہ دنیا کتنی ہی بھلکڑ ہو وکیل لوگ بہت کم بھولتے ہیں ان کا پیشہ ہی واقعات کو یاد رکھنا ہے اور ان کی کڑیوں کو ملا کر نتائج اخذ کرنا ہے۔ کوئی وکیل جماعت اسلامی کے پرانے مؤقف کو نہیں بھولا۔ دوسری بات یہ بھی یاد رکھنے کی ہے کہ ہمارا پڑھا لکھا طبقہ (اور وکلاء اس میں نمایاں ہیں) آجکل اسلام کا مطالعہ کسی نہ کسی طریقے سے کر رہا ہے۔ یہ درست ہے کہ ابھی ان کی پہنچ منابع تک نہیں کیونکہ ان میں سے اکثریت عربی زبان کو زبان کی حیثیّت سے نہیں پڑھتی اس کے مقابلے میں جماعت اسلامی میں کچھ ایسے لوگ ملازم ہیں جو تھوڑی بہت عربی جانتے ہیں اور اس طرح جماعت اسلامی کے بڑوں کی عربی دانی اور دین فہمی کا بھرم قائم رہتا ہے۔ لیکن ان سب مشکلات کے باوجود پڑھا لکھا طبقہ اسلام کو سمجھنے کی پوری کوشش کر رہا ہے اب بہت کم دائرے ایسے ہیں جن میں اس طبقے کو کسی قسم کی غلط فہمی میں مبتلا کیا جا سکے۔